ر علی سید

شام میں زینب دیتی ہیں

جل جلالہ‘

جو حرف حرف میں عکسِ جمال تیرا ہ

تو اس میں میرا ہے کیا، سب کمال تیرا ھ

شامیں فریب دیتی ہیں

دوست عزیز
راشد
کے لئے
بہت سی محبت اور خلوص [illegible]
اور دیوانگی سے فرزانگی کی [illegible]

ناصر علی سید

ناصر علی سید
۲۶ اگست [illegible]

پاکستان مرکزی ہندکو ادبی بورڈ (رجسٹرڈ) پشاور

شامیں فریب دیتی ہیں

نومبر 2007ء

شاعری: ناصر علی سیّد

اہتمام: سیّد ذی شان ناصر۔ ابتسام علی سیّد

کمپوزنگ: عمران یوسفزئی (0345-9037351)

پروف: جواد۔ اعجاز احمد

سرِورق: افراز علی سیّد

ناشر: عزیز احمد خان

مطبع: APS ایڈوٹائزنگ

تعداد: 500

قیمت: 200 روپے

رابطہ

Hassam Hurr

Linus Street Hurr City Hu13LY England

....

پاکستان مرکزی ہندکو ادبی بورڈ (رجسٹرڈ) پشاور

92-091-2573292-Cell:03005821433

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

بھگو دے سوچ کو خوشبو سے جب ہوائے بہار
لکھوں جو نعت تو لفظوں کو خود سجائے بہار

میں تیرے شہر کی مٹی کو آنکھ سے چوموں
کبھی مجھے بھی تو اس طرح دن دکھائے بہار

ہر ایک لمحہ جہاں پر ہے رحمتوں کا نزول
وہ در ہمیشہ مہکتا رہے ورائے بہار

بس ایک لمحہ کو پلکیں اٹھی تھیں اس کی طرف
تو کائنات نے اوڑھی تھی پھر رِدائے بہار

وہ جس کی وجہ سے خوشبو کو اعتبار ملا
میں اس سخی کو بھلا کیا کہوں سوائے بہار

اَذیتیں ہوں وہ طائف کی یا کہ بَطحا کی
مرے حضور نے سب کچھ سہا برائے بہار

جو اُس دیار سے گزری تو اُس پہ کیا گزری
کبھی تو کان میں چپکے سے یہ بتائے بہار

پھر اس کے چہرے پہ رونق کو دیکھنا تم بھی
کبھی جو دل میں مری نعت گُنگنائے بہار

نہ جانے حالتِ دل اس گھڑی ہو کیا ناصر
جب اپنے در پہ بلائے مجھے خدائے بہار

جدید دور کا شاعر

ناصر اپنی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کا امتزاج لئے ہوئے ہیں ان کی نظر واقعات عالم کا مطالعہ بھی کرتی ہے اور داخلی جذبات کا حسن بھی رکھتی ہے وہ اپنی شاعری میں حسن کا ایک مخصوص نظریہ لئے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری کے الفاظ میں حسن گندھا ہوا ہے وہ حسن کے مختلف زاویوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ حسن ان کے نزدیک محض خدوخال کے دروبست کا نام نہیں وہ تو حسن کی پہنائیوں کا درک بھی رکھتے ہیں۔ حسن جو انسانی شعور کی وسعتوں پر محیط ہے، حسن جو موجود میں بھی ہے اور ماورا میں بھی پڑا ہے............ وہ محض لفظوں کا سہارا نہیں لیتے بلکہ لفظوں میں تخیل کی روح کو بھی شامل کرتے ہیں۔ حسن جو خوبصورتی کا Symbol بھی اور بدصورتی میں بھی مثبت کا ادراک رکھتا ہے۔

ان کی شاعری میں جہاں کلاسیکیت کی جھلک نظر آتی ہے وہاں جدیدیت کا شعور بھی دکھائی دیتا ہے۔

حُسن کے اونچے سِنگھاسن پر گوری تیرا روپ
تو صُبح کی شِیتل چھایا تو جاڑے کی دھوپ

روز شامیں فریب دیتی ہیں
روز دیتا ہے اک دلاسا دن

ناصر علی سید اکوڑہ خٹک کے ایک سربرآوردہ سیّد گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد ایک جیّد عالم دین اور قابل تعظیم شخصیت تھے، انہی کے زیرِ عاطفت ناصر نے علم وادب کے گہوارے میں تربیت پائی۔

ناصر جدید دور کا شاعر ہے، ان کے Diction میں جدیدیت کی روح بھی کارفرما ہے۔ کلاسیکیت کا پرتو بھی ملتا ہے، ناصر کی زیرِ نظر کتاب ان کی شعوری کوششیں اور لاشعوری ترنگ کی کیفیتیں لئے ہوئے ہے۔ وہ سرحد کے شعراء میں ایک نمایاں مقام کے حامل ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ سرحد کے جدید شعراء میں ناصر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ انہیں زندہ رکھے گا اور جدید دور کے لئے ایک تحفہ سے کم نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر خاطر غزنوی
گل بہار، پشاور

آئینہ در آئینہ

ایک خود آگاہ شاعر .... الف

بیتی شاموں کا خسارہ .... میم

یہ اور بات کہ موجود اپنے گھر میں ہوں 1

غموں سے دوستی مہنگی پڑی ہے 3

گھبرا کے میرے شانے پہ وہ جھک سا گیا تھا 5

حلقہ زن ہو کے کرو، رقص کرو 7

دعائے نیم شبی میں جو کچھ اثر بھی نہیں 9

خسارہ 11

اُداسی کی ایک نظم 12

ابھی تجدید کا موسم نہیں آیا 15

بزم میں باریاب تھا کل شب 16

سرابوں کا سہارا ڈھونڈتا ہوں 18

سرہانے شام کے تنہا کھڑا ہوں 20

دشت کے چلنا ہے گر پار، ذرا آہستہ 22

جتنا سمجھا تھا معتبر سپنا 24

بستی نجام الدینؒ (ایک تاثر) 26

انسپریشن 28

ڈراپ سین 29

ہر ایک زخم میں سینے کے کانچ بھرتا ہوا 31

دھوپ میں جلتا پابرہنہ دن	33
ہجوم یادوں کا اور دل کی رہگذر تنہا	37
فلک پر مشورے پھر ہو رہے ہیں	39
یہ جو میری ہے یہ تدبیر تمھاری ہوتی	41
چوتھی کھونٹ	43
فرار	45
سبز قدم دن	46
انتظار کا لمحہ رَت جگوں سے باندھا ہے	47
بچھڑنے والے کو کیا کیا صدائیں دیتا ہوں	49
کھلا کہ ہجر سی لذت دم وصال نہیں	51
وہ جو اک لفظ کہ خسارہ ہے	53
شکستہ پائے مسافت دہائی دیتے ہیں	55
کہنے کو جو یوسف سر بازار گیا ہے	57
بشرطِ اُستواری	59
روٹین	62
ہائیکو	63
مرے موسم تری آب و ہوا میں سانس لیتے ہیں	64
پھر ٹپکتا ہے اِن آنکھوں میں لہو رات گئے	66
تجھے پانا ضروری یا کہ پھر کھونا ضروری ہے	68
علاج کرتا رہا دل کا چارہ گر لیکن	70
گیت	71
تاثیر	73

چوتھی ہجرت	75
سین ریو	77
اب بساطِ وقت پر شاید تماشا اور ہو	79
''درودیوار پہ حسرت کی نظر'' سے پہلے	81
مسلسل دستکیں سی ہو رہی ہیں	83
محبتوں کے مراحل کے باب رہنے دو	84
وہ ایک لمحہ کہ ادراکِ ذات ہوتا ہے	86
اُردو ٹپے	87
شبِ فراق خیالِ وصال کم کم ہے	89
کیوں کوئی گلہ ہوتا ہل کے جو گیا ہوتا	91
ہوئی ہے یاد سے تیری یہ خاص عام سی شام	93
نہ تیرے گھر کا نہ اپنے ہی گھر کا رہنے دیا	95
گلزار کے لئے	97
بہت ہی کم سہی، ساغر میں بادہ ہے تو سہی	99
جلا کر رکھ دیئے ہیں خط کسی کے	101
پانے کو تیرے ہم نے جتن کیا کیا کیے	103
قہرِ درویش	105
کراچی (جاگتی راتوں کا شہر)	106
ہائیکو	107
کل سے کیوں یہ آج ہے بدتر، پہروں سوچتا رہتا ہوں میں	108
شام ڈھلے اب لگتا ہے سب دھوکا تھا	110
خواہشوں کے حصار میں رہنا	111

وہ دیواریں اگاتا ہے پہ دروازے نہیں دیتا 113
دوستوں سے دشمنی ہے 115
پھولوں کے کھلنے کا موسم 116
دسمبر آخری سانسوں پہ ہے 118
یہ کیسے خوف کی پرچھائیوں میں زندہ ہوں 120
احوال موسموں کا سمجھنا محال ہے 122
چاروں جانب جبڑے کھولے کالی بلاؤں کا سایہ ہے 124
''جلتی ہوئی پیشانی'' پہ اک ہاتھ بہت ہے 126
یہ چند سانسیں جو دی ہیں تو اختیار بھی دے 128
...... کے نام 130
محفوظ کل کے لئے ایک دعا 133
بجھتا ہے کیسے جاں کا دیا مجھ کو دیکھ لے 136
جگنو، کبھی تتلی، کبھی خوش رنگ غبارا 138
سفر میں جب بھی دل مشکل مراحل کھینچتا ہے 140
بھیک جب مانگنے نکلوں گا تو ڈر کتنے ہیں 142
تمھارے جسم کو چھو کر عجب شوخی دکھاوے ہے 144
ہائیکو 146
جو چاہتے ہو امر دل کی چاہتیں رکھنا 147
نیا عہد نامہ 149
ایک اَن ہونی کا ڈر ہے اور میں 151
دل آنکھیں اور پتھر سائیں 153
مرے خیال میں اور میری جستجو میں رہے 157

اک عام سے دن کو وہ مرے گھر ترا آنا 159
روز و شب اب ہوئے عجب یعنی 160
8 مارچ 162
اُردو ٹپے 163
ایک مدت سے ہوں میں سرِ گریباں ناصر 164
صداقتوں کے سفر کی یہی کہانی ہے 166
کیپ کاڈ 168
ٹپے 171
میں کیسے مدحتِ سرکار میں زباں کھولوں 172
ہو دن کہ رات ذکر ترے چشم و لب کا ہے 174
ویلنٹائن ڈے 175
وہی منظر پرانا چاہتا ہے 176
تری یادوں کے جھولے میں جُھلا ہوں 178
وہ ایک رات کہ دیکھے تھے جس کے خواب بہت 179
بدن کے چیختے چلاتے موسموں کے عذاب 181
پشاور ریڈیو کے لئے ایک نظم 183
کتنے مانوس جزیروں سے گذر جائیں گے 185
ٹپے 187
وَصل کو خود کرے بحال تو پھر؟ 188
سو بھیدوں کی رات کا قصہ 190
غمِ جہاں سے غمِ جاں تک (یوسف رجا چشتی) 192
بندہ کتا خیر (پروفیسر طٰہٰ خان) 197

ایک خود آگاہ شاعر

ناصر علی سیّد کا کہنا ہے......

''محبت موسموں اور وقت کی ترتیب سے

آزاد ہوتی ہے

بہت برباد کرتی ہے

تو خود آباد ہوتی ہے'' (بشرط استواری)

کسی بھی جستجو، کسی بھی لگن کو پورا کرنے کیلیے اپنا آپ مٹا دینا شرط نہیں ہے ویسے بھی محبتوں میں شرطوں کا کیا عمل دخل؟

الف

تاہم اپنے آپ سے ایک اَن کہا عہد کرنا پڑتا ہے اور اسی عہد کو نبھاتے رہنا ہی وہ کمٹمنٹ ہے جو "بہت برباد کرتی ہے"

ناصر علی سیّد ایک ہمہ جہت شخصیت ہے اور ہر جہت میں وہ بھرپور طور پر عمل پذیر رہتا ہے، یہی جہتیں اس کی محبتیں ہیں جنہیں وہ آباد بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

یہ جو ناصر علی سیّد بہت مشغول ہے تو دلچسپ بات یہ ہے (جس کا انکشاف اس کی شاعری کرتی ہے) کہ اس کے بھیتر میں "تنہائی" ڈیرے ڈالے بیٹھی ہے، کہیں "اندر ویرانہ ہے" کہیں "رہگذر تنہا" ہے اور کہیں وہ "تنہائی کی سولی" سے اتارے جانے کا منتظر ہے، اس کی شاعری میں یہ تذکرہ تسلسل سے ہو رہا ہے اور وہ اسے "اُنگلوں سے باندھتا" چلا آ رہا ہے، یہ تکرار اسی لئے Surface نہیں ہو رہی۔ یہ ہر مرتبہ نئے زاویے، نئے Shade کے ساتھ ابھرتی ہے۔

مرے اندر شور مچائے
چُپ کا ایک سمندر سائیں

مضامین کی رنگارنگی نے ناصر کی شاعری میں ایک جھلمل کی سی فضا بنائی ہوئی ہے میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ تہہ در تہہ پرتیں اس کی قسما قسم محبتیں ہیں جنہیں وہ آباد رکھے ہوئے ہے۔

کون سمجھے گا کہانی میری
کچھ کہی کچھ ان کہی ہے
نہ جانے کون سا موسم مجھے ہرا کردے
نمو کے واسطے بے تاب ہوں، شجر میں ہوں

....

ایک وعدے کو اوڑھ کر سونا
اک کے قرب و جوار میں رہنا

....

میں پڑھتا رہتا ہوں لکھتیں پرانی
سو کھویا وقت سارا ڈھونڈتا ہوں
ادھورے کام ہیں کتنے مگر اک دو تو ایسے ہیں
دمِ رخصت سے جن کا پیشتر ہونا ضروری ہے

یہی احساس اس سے یہ بھی کہلواتا ہے۔

تمھارے واسطے کیا کر سکوں گا
میں اپنے واسطے کیا کر سکا ہوں

آنے والا عہد اس پر اپنا پرتو ڈالتا ہے تو ناصر کہہ گذرتا ہے۔

وقت عکّاس ہے تصویر اُسے لینا ہے
تم گرانا مری دستار ، ذرا آہستہ

ناصر نے سوال بھی سموئے ہوئے ہیں۔

نہ جانے اگلی گھڑی کیا سے کیا میں بن جاؤں
ابھی تو چاک پہ ہوں دستِ کوزہ گر میں ہوں

....

نہ تیرے در کا نہ اپنے ہی گھر کا رہنے دیا
کیا ہے کیسا یہ ہم سے ترے جہان نے ہاتھ

....

رات کو اپنے کمرے میں جب تنہا سا میں رہ جاتا ہوں
کیا کیا مجھ پر بیتی دن بھر، پہروں سوچتا رہتا ہوں میں

ہر حساس دانشور کی طرح ناصر بھی مٹتی ہوئی قدروں کو سراسیمگی سے دیکھتا ہے

جسے بھی دیکھئے لگتا ہے بھیڑیا بھوکا
لو اب تو شہر میں در آئے جنگلوں کے عذاب

خون آشام بلاؤں کی ہے زد میں دنیا
جانے کب اتریں یہاں پیار کی پریاں ناصؔر

ناصر کے شعری روّیے عموماً اپنے عصر سے مربوط ہیں وہ کسی بھی اسلوب کو اپنانے سے گریز نہیں کرتا چونکہ روایت اور کلاسیک سے بھی بدرجہ اتم آشنا ہے اس لئے رنگِ قدیم میں بھی قدرتِ اظہار کا مظاہرہ کرتا ہے اور میرؔ و غالبؔ سے استفادہ کرتا نظر آتا ہے۔

گاؤں اور بچپن اسے گدگدی کرتے رہتے ہیں سو وہ کبھی سرشار ہو کر اور کبھی ملول ہو کر ان یادوں کو Paint کرتا ہے۔

بہت روتی ہے پرُکھوں کی حویلی
وہیں دل لوٹ جانا چاہتا ہے

کھیل بچپن کے ، لڑکپن کے بہت دلکش تھے
اُس زمانے میں کہاں لوٹ کے ہم جائیں گے

اس مجموعے میں ناصر علی سیّد کی چند نظمیں بھی ہیں جن میں تنوّع پایا جاتا ہے۔ میں نے اپنے اس تاثر کے شروع میں ناصر ہی کی ایک نظم ''بشرط استواری'' کی آخری سطور نقل کی ہیں، میری دانست میں ناصر کی شاعری کا مزاج ان ہی سطور میں اپنی چھب دکھلاتا ہے۔

غزل میں شاعر کی زنبیل طرح طرح کے غلافوں سے پُر ہوتی ہے اور شاعر ان کو سہولت اور تواتر کے ساتھ اوڑھتا اتارتا رہتا ہے اور غزل اس کے مزاج کی چغلی میں بخل سے کام لیتی ہے، اس کے برعکس نظم مختصر یا طویل یہ چغلی بڑی ''دیانتداری'' سے کھا جاتی ہے۔ سو میرا کہنا ہے کہ شاعر کی سرشت سے آگاہی کیلئے اس کی نظمیں (اگر اس نے کہی ہیں) کلید بردار ہیں۔

بات سے بات نکلتی ہے، ناصر ایک منجھا ہوا ڈرامہ نگار ہے اور خیال کیا جا سکتا ہے (بلکہ کیا بھی جاتا ہے) کہ پھر نظم کہنا تو ایسے فنکاروں کیلئے کچھ مشکل نہ ہوتا ہوگا...... جی نہیں اور قطعاً ایسا نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈرامہ نگار کے پہلو میں ہر طرح کے اوزار کی افراط رہتی ہے لیکن جب اسے نظم کی ''تخلیق'' کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو یہ اوزار اس کی مدد سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ایسے میں فنکار کی اپنی شعری اُپج ہی اس کی انگلی تھامتی ہے اور فنکار، شاعری کی دل آویز بھول بھلیوں میں محوِ خرام رہتا ہے۔ لہٰذا ناصر کا ڈرامہ نگار اس کے پہلو بہ پہلو نہیں چل سکا۔ شاعر ناصر ہی ان روشوں اور دالانوں سے گذرا ہے۔

ناصر کی تین نظمیں موضوع کے اعتبار سے ایک حد تک مماثل ہیں اور وہ ہیں بشرط استواری، دسمبر آخری سانسوں پہ ہے، اداسی کی ایک نظم، دراصل ایک کیفیت تینوں shades میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔

گلزار کیلئے نظم، اعجاز راہی (مرحوم) کیلئے نظم نیز جوہر میر (مرحوم) کیلئے نظم شاعر کی ان شخصیات کے ساتھ وابستگی یا عقیدت کی عکاس ہیں اور اچھی نظمیں ہیں۔

محفوظ کل کیلئے ایک دعا سے۔

''یہ مٹی کا گھر ہے
مگر اس کی مٹی سراپا گہر ہے
اخوت، محبت کی شبنم سے جیسے یہ گھر تر بتر ہے
زمیں ہے
مگر تا فلک معتبر ہے۔''

ان لائنوں نے سرشار کیا۔

کوئی مضائقہ نہیں اگر ناصر سے یہ کہا جائے کہ وہ اب تو اتر سے اور ''کھل کر'' نظمیں کہے۔

سجاد بابر
87/3۔گلی نمبر 4
اشرفیہ کالونی۔ پشاور

بیتی شاموں کا خسارہ

............اور اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو اونگھتی ہوئی کتنی ہی بے خواب راتوں کے جاگتے دریچوں کے ٹھنڈے شیشوں پر فریب دیتی ہوئی کٹھور شاموں کے کھلنڈرے لمحوں کی دستکوں کی سمفنی زندگی کے میلے میں بچھڑے ہوؤں کی یاد کے تاروں کو مرتعش کرتی رہی ہے۔ اور پھر ایسی ہی کتنی راتیں، دھوپ میں جھلستے ہوئے دن اور انتظار کی سولی پر ٹنگی ہوئی شاموں کے خسارے سے میری نیندوں کا آنگن بھرتی رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کھوئی ہوئی ساعتوں کی تلاش ایک سعیٔ رائیگاں ہے مگر اسی سفر میں وہ ان دیکھے جزیرے بھی تو دامن دل کھینچ لیتے ہیں جنہیں نامعلوم کے وقتوں سے کسی اجنبی کا انتظار رہتا ہے کیونکہ انہیں بھی علم ہے کہ یہ جہاں برباد لوگوں نے ہی آباد کیا ہوا ہے۔ بھٹکے ہوئے لوگوں نے، دھتکارے ہوئے لوگوں نے اسے رونق بخشی ہے کہ دلوں کی جنتوں سے نکالے ہوئے لوگ ہی ہمہ وقت دوسروں میں خوشیاں اور سرشاریاں بانٹتے رہتے ہیں۔ اس عمل میں خسارے کا دکھ

میم

آنکھوں میں مسلسل دھواں بھرتا رہتا ہے۔ اس سے بچھڑنے والوں کی یادیں بھی ہمیشہ تروتازہ رہتی ہیں اور خود سے ایک لمبی بات کرنے کا سلیقہ بھی آجاتا ہے۔ بس ایسے ہی کچھ خسارے میری یادوں کی گٹھڑی میں بندھے ہوئے ہیں، جانے انجانے میں کیا کچھ میں کھو بیٹھا ہوں میرے جیسے مبتلا شخص کو تو ہاتھوں سے باندھی ہوئی اس گٹھڑی کو دانتوں سے کھولنے کا ہنر بھی نہیں آتا۔ جانو یہ ایک بے ترتیب سا گوشوارہ ہے۔ جس میں گاؤں کی صبحوں، شہر کی شاموں، مجھے برباد کرنے والے خوابوں اور آباد رکھنے والے کچھ چہروں کا حساب کتاب ہے، جنہیں میں تو کھوجنے میں ناکام رہا ہوں لیکن اگر اس سفر کی کہانی پڑھتے ہوئے کسی موڑ پر بچھڑے ہوئے کسی بہت ہی اپنے کی یاد سے آپ کی آنکھوں میں کوئی منظر دھندلا جائے تو جان لیجیے کہ جس طرح گاؤں کی اُجلی صبحوں سے بے اختیار کیے جانے والوں نے شہر کی سانولی سلونی شاموں میں رونق کے رنگ بھر دیئے ہیں تو بالکل اسی طرح کے اُجڑے اور بے آسرا لوگوں نے ہی اس آباد دنیا کے باسیوں کو جینے کا ہنر اور سلیقہ سکھلایا ہے۔

ناصر علی سیّد

nasiralisyed@hotmail.com

رفعت کے نام

اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طُوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے

غالب

رنگِ حالِ هیچ کس ، بر هیچ کس روشن نه شُد
شمع گل کردند یاراں یا زِ محفل بُرده اَند

بیدلؔ

یہ اور بات کہ موجود اپنے گھر میں ہوں
میں تیری سَمت مگر مُستقل سفر میں ہوں

نہ جانے اگلی گھڑی کیا سے کیا میں بن جاؤں
ابھی تو چاک پہ ہوں دستِ کوزہ گر میں ہوں

میں اپنی فکر کی تجسیم کس طرح سے کروں
بُریدہ دست ہوں اور شہرِ بے ہُنر میں ہوں

نہ جانے کون سا موسم مجھے ہرا کر دے
نُمو کے واسطے بے تاب ہوں شجر میں ہوں

یہ دوستی بھی عجب چوبِ خُشک ہے ناصرؔ
نبھا رہا ہوں مگر ٹوٹنے کے ڈر میں ہوں

غموں سے دوستی مہنگی پڑی ہے
سَراسر زندگی مہنگی پڑی ہے

تمسخر کا نشانہ بن گیا ہوں
سرِ مژگاں نمی مہنگی پڑی ہے

اُدھر پہنچی ہیں سب باتیں اِدھر کی
ہَوا سے دوستی مہنگی پڑی ہے

بھری محفل میں تنہا ہو گیا ہوں
مجھے تیری کمی مہنگی پڑی ہے

مرے آنگن میں دریا آن پہنچا
صدائے تِشنگی مہنگی پڑی ہے

کسی کے ہاتھ آئے ہیں خزانے
کسی کو دل لگی مہنگی پڑی ہے

حسینوں سے مری صاحب سلامت
مجھے مہنگی ، بڑی مہنگی پڑی ہے

مُلاقاتیں نظاروں پر کُھلی ہیں
چٹکتی چاندنی مہنگی پڑی ہے

اکیلا کردیا یاروں نے ناصر
بہت ہی آگہی مہنگی پڑی ہے

گھبرا کے میرے شانے پہ وہ جھک سا گیا تھا
جب چاند دریچے کے برابر میں رُکا تھا

بے سمت تو جانا تھا مجھے تیرہ شبی میں
اک چاند سا چہرہ جو نگاہوں میں بسا تھا

ہونٹوں پہ مرے دھوپ نے جب پیاس لکھی تھی
اُس وقت میں دریا کے کنارے پہ کھڑا تھا

اک لمحہ کو تو وقت نے بھی موند لیں آنکھیں
وہ نیند میں تھا ، چاند اُسے دیکھ رہا تھا

سو چھید مرے دل میں تبسّم سے کرے ہے
اور کل تو مرے سامنے وہ ہنس بھی پڑا تھا

لکشمی سے حُسن کی پھر بھی نہیں مایوس ، میں
شب ہے دیوالی کی اور جلتا دیا گھر میں نہیں

حلقہ زن ہو کے کرو، رقص کرو
ہم سے آشفتہ سَرو، رقص کرو

سانس کے پاؤں میں گھنگھرو بولیں
لَے کو مدّہم نہ کرو، رقص کرو

یہ جو آغاز ہے انجام بھی ہے
تم بھی سُر ساز کرو، رقص کرو

لوگ تھک ہار کے چُپ بیٹھ گئے
تم تو اے دیدہ وَرو، رقص کرو

اس سے پہلے کہ ہو مَصلوب اَنا
سر ہتھیلی پہ دَھرو ، رقص کرو

غیر سے مل کے نہ الزام کبھی
اپنے آنگن پہ دَھرو ، رقص کرو

اُس کی آنکھوں میں ہے رَقصاں وحشت
تم بھی پیمانہ بھرو ، رقص کرو

کم سے کم گھر میں تو نکلو خود سے
محتسب سے نہ ڈرو ، رقص کرو

ایک نعرہ ...... تناناہُو۔یاہُو
یعنی اک جام بھرو ، رقص کرو

اس گھٹن کا ہے یہی حل ناصر
روز و شب رقص کرو ، رقص کرو

دُعائے نیم شبی میں جو کچھ اثر بھی نہیں
تو اب کے حال کا پُرساں کوئی اُدھر بھی نہیں

سوائے دَربدری اور کون جانے ہے
کہ میرے شہر کے نقشے میں، میرا گھر بھی نہیں

نہیں ہے ساتھ کوئی بے کسی کا موسم ہے
سو رو رہا ہوں، مگر میری آنکھ تر بھی نہیں

عجیب طرح سے خالی یہ دن گزرتے ہیں
خبر بھی کوئی نہیں یارِ بے خبر بھی نہیں

رِیاضتیں ہوں مُسلسل تو پھول کِھلتے ہیں
محبتوں کا شجر ایسا بے ثمر بھی نہیں

کسی کو شاعری ورثے میں تھوڑی ملتی ہے
یہ خونِ دل سے نہ سینچو تو معتبر بھی نہیں

اِک ایسے موڑ پہ بازی میں شہ پڑی ناصر
کہ کام کا کوئی مُہرہ بِساط پر بھی نہیں

خسارہ

نکل کر گاؤں کی کچی حویلی سے
میں جب کھیتوں سے،
کرنوں سے لدے خوشبو بھرے پیڑوں،
بہت آباد کھلیانوں سے
اور شہرِ خموشاں سے گذر کر
شہر کی جانب چلا تھا تو
بہت ہی زور سے
روتی خزاں کی بارشوں کا پہلا دن تھا

اُداسی کی ایک نظم

بہت ہی بولتی آنکھوں کو
کل تقریب میں خاموش سا دیکھا
تو دل میں ہوک سی اٹھی
کہ جن آنکھوں پہ پلکوں کی
کُشاد و بَست سے دِل سانس لیتا تھا
زمیں کروٹ بدلتی تھی
فلک جھالر ستاروں سے بناتا تھا
ہوائیں رُک سی جاتی تھیں
ندی بھی گنگنانا بھول جاتی تھی

رُتیں مڑمڑ کے رُکنے کو ترستی آگے بڑھتی تھیں
وہ آنکھیں جس طرف اُٹھتیں
وہاں پر دیر تک پھر
خوشبوؤں کے میلے لگتے تھے
وہیں پھر رنگ بھی اٹھکیلیاں کرتے ہوئے
بے رنگ خاکوں میں عجب مستی سی بھرتے تھے
وہ آنکھیں جھوٹ کیوں کہتیں
مگر وہ جھوٹ بھی کہتیں تو
خود پر سے یقیں سچ کا بھی اُٹھ جاتا
وہ آنکھیں
ہاں وہی آنکھیں
جو ہر تقریب کا سنگھار ہوتی تھیں
وہ آنکھیں اب مگر تقریب میں
بے چارگی سے ایک جانب
ٹکٹکی باندھے ہوئے خاموش سی محوِ تماشا تھیں
تعاقب میں ان آنکھوں کی نظر کے
میں نے جب دیکھا

بہت سفّاک منظر تھا
کہ اُس تقریب میں
سب بے قرار آنکھوں کا مرکز
اب بہت ہی بولتی
جادو بھری، گہرے سمندر کی طرح سے
نیلگوں آنکھیں لئے
اِک اور چہرہ تھا

گراں نہ ہجر کا موسم ہو فاصلے پہ رہو
شبِ وصال دیا اُس نے مشورہ کیسا

بڑے تپاک سے ملتا ہوں اپنے یاروں سے
دیا ہے مجھ کو میرے رب نے حوصلہ کیسا

ابھی تجدید کا موسم نہیں آیا

ابھی تجدید کا موسم نہیں آیا
ابھی تم شرمگیں آنکھوں سے
مجھ کو یوں تو مت دیکھو
کہ میرا آہنی پندار
بن کے ریت کی دیوار
ڈھے جائے
ابھی گھٹنوں کے بل ہی تو جدائی سانس لیتی ہے

بزم میں باریاب تھا کل شب
ذرّہ بھی آفتاب تھا کل شب

اُس نے میرا بھی حال پوچھا تھا
میں بھی عزّت مآب تھا کل شب

کون نادم محبتوں پہ ہوا
پھر بھی اِک اضطراب تھا کل شب

کس سمندر کی بات کرتے ہو
چشم کا ہمرکاب تھا کل شب

آنکھ کی قید میں رکھے آنسو
گرچہ دُکھ بے حساب تھا کل شب

میرے پہلو میں چاند سویا تھا
کیا مزے کا وہ خواب تھا کل شب

کھل گئی نیند اوّلِ شب میں
پھر تو پَل پَل عذاب تھا کل شب

بخش بیٹھا تھا جاں کے دشمن کو
دل مِرا بُو تُراب تھا کل شب

سرابوں کا سہارا ڈھونڈتا ہوں
خسارے میں خسارہ ڈھونڈتا ہوں

فلک پر ہوں تو مجھ پر طنز مت کر
زَمیں تیرا ستارہ ڈھونڈتا ہوں

میں پڑھتا رہتا ہوں ''لِکھتیں'' پرانی
سو کھویا وقت سارا ڈھونڈتا ہوں

وہ جس سے گرم تھا بازارِ الفت
وہی سِکّہ دوبارہ ڈھونڈتا ہوں

گھڑی بھر مل کے مجھ سے درد بانٹے
کوئی قِسمت کا مارا ڈھونڈتا ہوں

ورق کچھ ڈائری میں رہ گئے ہیں
جوانی کو دوبارہ ڈھونڈتا ہوں

وہ شفق ہو کہ سمندر کہ مرا دل ناصرؔ
شام ہوتی ہے تو ہر چیز لہو روتی ہے

سَرہانے شام کے تنہا کھڑا ہوں
سراپا یاس ہوں چُپ ہوگیا ہوں

مری مُٹھی سے پھسلے ریت لمحے
اُنہی کو سوچتا ہوں کھوجتا ہوں

سمیٹوں کس طرح میں اُجڑی سانسیں
شِکستہ دل ہوں ٹوٹا آئینہ ہوں

ترستا ہی رہا ہوں نقشِ پا کو
میں چوتھی کھونٹ ، اُجڑا راستہ ہوں

مجھے آواز اب دو بھی تو کیا ہے
کہ میں بَستی سے باہر آ چکا ہوں

وہ خال و خد بھی اب بجھنے لگے ہیں
میں جن سے روشنی لیتا رہا ہوں

میں اِک پُرکار سا گُھوما ہوں کتنا
مگر پھر بھی ادھورا دائرہ ہوں

دَشت کے چلنا ہے گر پار ، ذرا آہستہ
مجھ سے کہتے ہیں مرے یار ، ذرا آہستہ

تیز تر بادِ بہاری سے یہ کہہ دے کوئی
خود سے ہوں برسرِ پیکار ، ذرا آہستہ

وقت عکّاس ہے تصویر اُسے لینا ہے
تم گرانا مری دستار ، ذرا آہستہ

کل تو کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہ دیا
آج لیکن مری سرکار ، ذرا آہستہ

وقت نے دیکھ لے کیا حال کیا ہے میرا
اے مِرے دوست مِرے یار ، ذرا آہستہ

وقت کے پھیر سے کب کون بچا ہے لیکن
میری تقدیر کے پُرکار ، ذرا آہستہ

جتنا سمجھا تھا معتبر سپنا
جھوٹا نکلا ہے اُس قدر سپنا

میں تھا سلجھا رہا ابھی گرہیں
ہو گیا پھر اِدھر اُدھر سپنا

ایک کروٹ ہی میں تمام ہوئی
زندگی ...... جیسے مختصر سپنا

حُسن بارہ دری ہے حیرت کی
عِشق بے چارہ دَر بَدر سپنا

ساتھ تیرا کہاں میسّر ہے
ایک مدت سے ہم سفر سپنا

موت تعبیر اُس کی ہے ناصر
ہم نے دیکھا جو عمر بھر سپنا

بستی نظام الدینؒ

(ایک تاثر)

عَجب گہری خَموشی ہے
مگر اِک شُور و ہنگامے کا اس کے پاس ہی
دریا بھی بہتا ہے

عَجب گہری اُداسی ہے
مگر پہلو میں اِس کے خوشبوؤں، رنگوں کی
اور سرشاریوں، سرمستیوں کی حکمرانی ہے
عجب اِک رونقِ بازار ہے
ہنگامہ ہے...... ہنگامہ بھی ایسا
کہ اپنی بات بھی اپنی سماعت کے حوالے کرنے کو
ہر اک ترستا ہے

بہت پُرشور اِس بستی کے بیچوں بیچ
اِک ایسی عمارت ہے
جہاں...... گہری خَموشی ہے
جہاں...... گہری اُداسی ہے
جہاں...... اَفسردگی
سر اپنا شانوں پر ہوا کے رکھ کے
کچھ بیتے زمانے یاد کرتی ہے
مجھے برباد کرتی ہے
بہت بے حال کرتی ہے

(مزارِ غالبؔ)

انسپریشن

آنکھیں جب تک
تیرا چہرہ سوچ نہ لیں
اور
سوچیں تیری جادوئی مُسکانیں
جب تک اوڑھ نہ لیں
سچ کہتا ہوں
غزلیں، نظمیں اور افسانے
مجھ سے روٹھے ہی رہتے ہیں

ڈراپ سین

ہرلڑکی کا اپنا موسم
اپنے بادل
اپنی بارش
اپنے دُکھ سُکھ
ہرلڑکی کا اپنا میت
ہرلڑکی کا اپنا آنگن
اپنی اُلجھن
اپنی سلجھن
اپنی سوچیں
اپنی باتیں
اپنی رَسمیں رِیت
ہرلڑکی کا اپنا کمرہ،
اپنا تکیہ اپنے خواب

ہر لڑکی کا اپنا دریچہ، اپنے پھول اور
اپنی آس اُمید
ہر لڑکی کے اپنے قصّے
اپنی نظمیں
اپنی غزلیں
ہر لڑکی کے اپنے گیت
اپنی ہار اور جیت
لیکن......
سب کی ایک ہی عادت
ایک ہی قسمت سب کی ہے
عادت...... کہ جب
پیار پڑے جھولی میں تو
اِک خاص ادا سے
ٹھکرا دینا
قسمت...... کہ جب
ہوش آئے
تو پچھتاوے کے
زرد سویٹر بُنتے رہنا

ہر ایک زخم میں سینے کے ، کانچ بھرتا ہوا
کچھ اس طرح سے میں جیتا ہوں روز مرتا ہوا

یہ اب جو بوند بھی باقی نہیں ہے آنکھوں میں
کبھی یہیں تھا سمندر سا شور کرتا ہوا

بلندیوں سے پکارا ہے پھر مجھے اُس نے
سو جا رہا ہوں ہواؤں پہ پاؤں دھرتا ہوا

یہ کیسا کھیل مرے ساتھ زندگی کھیلے
کہ ڈوب ڈوب رہا ہوں مگر اُبھرتا ہوا

نظر میں ڈھول پرانی رفاقتوں کی لئے
گلی سے تیری میں چپ چاپ سا گزرتا ہوا

شمار کر نہیں پائے گا وحشتیں تُو بھی
جو ایک بار کبھی تجھ پہ تیرا خواب کُھلے

بچھڑنے والوں کے چہرے لہو رُلائیں گے
رفاقتوں کے سفر کی اگر کتاب کُھلے

دھوپ میں جلتا پابرہنہ دن
شام ملنے کو مجھ سے آیا دن

جانے پھر کیسے کھو گیا مجھ سے
میری شاموں کا وہ شناسا دن

آج دن بھر تجھے نہیں دیکھا
آج کا دن نہیں تھا میرا دن

تیری زلفوں میں سانس لینے کو
شام کو آتا ہے جھلتا دن

تیری آنکھوں کی مہربانی ہے
ورنہ میں اور یہ نشیلا دن

ہنستے ہنستے دیا تھا اِک بوسہ
ہم سفر تب سے مُسکراتا دن

تو جو چاہے تو شام رُک جائے
اک اشارہ ہو ، تو دوبارہ دن

شام کی سرحدوں نے چھین لیا
رات تک ورنہ ساتھ آتا دن

کیسے ہوتی طویل وصل کی شب
اگلے ہی پل نکل جو آیا دن

شام نے اوڑھی جب شفق چُنری
شرم سے چُھپ گیا بے چارہ دن

بے وفا شام تو اُداسی دے
دھوپ میں ساتھ دے گا اچھا دن

روز شامیں فریب دیتی ہیں
روز دیتا ہے اِک دلاسا دن

روز مِلتا ہے ایک سندیسہ
آج شاید ہے تیرا اچھا دن

وقت کی شاخ سے جھڑے لمحے
اُن میں تھا ایک میرا پیلا دن

رات ٹھنڈک تیرے تعلق سی
گرم سا ایک تیرا بوسہ دن

لاکھ پردوں کا ایک پردہ شب
سو خرابوں کا ایک خرابہ دن

اب اُداسی کو اوڑھے بیٹھا ہے
شام کا ویزہ ، آپ لایا دن

ایک دن لے چلے گا ساتھ مجھے
آخری گیت گنگناتا دن

نیند کے سحر سے نکل ناصر
دیکھ ، چڑھ آیا اچھا خاصا دن

ہجوم یادوں کا اور دل کی رہگذر تنہا
بھرا ہے شہر مگر میں ہوں کس قدر تنہا

بُلندیوں پہ تو تنہائیوں کے دُکھ ہوں گے
یہ سوچنا تھا تو رہنا تھا اُس نگر تنہا

یہ تیرے ہونٹوں پہ نیلاہٹیں سی کیسی ہیں
کہ زہرِ ہجر پیا میں نے عمر بھر تنہا !!

ہوئے تھے چھلنی تو کیوپڈ کے تیر سے دونوں
مگر یہ کیا کہ ہوا مجھ پہ ہی اثر تنہا

ہے دیکھنے میں تو کتنا ہی خوش نما جنگل
جو دِل کی آنکھ سے دیکھو تو ہر شجر تنہا

فلک پر مشورے پھر ہو رہے ہیں
زَمیں زادے مزے سے سو رہے ہیں

اندھیرا چھا رہا ہے شب سے پہلے
یہ کیسے دن زمیں میں بو رہے ہیں

تلاشِ آب میں تھک ہار کے سب
سرابوں کے کنارے سو رہے ہیں

گذشتہ سال کیا پایا تھا ہم نے
نئے اِس سال ہم کیا کھو رہے ہیں

میں اُن لوگوں میں خوش رہتا ہوں ناصر
کہ میرے خوں کے درپے جو رہے ہیں

تو نے جس طرح مجھے دیکھ کے ری ایکٹ کیا
میں بھی حیران ہوا ہوں تری حیرانی پر

چند لمحے مجھے پلکوں میں چھپا لے اپنی
میں بھی تصویر بنا پاؤں کبھی پانی پر

یہ جو میری ہے یہ تدبیر تمھاری ہوتی
چاند میں آج بھی تصویر تمھاری ہوتی

تم ہی کچھ حرف محبت کے عطا کر دیتے
میری جادو بھری تحریر تمھاری ہوتی

نیلی آنکھوں کی فسوں کاری اشارہ کرتی
دل کی ویران یہ جاگیر تمھاری ہوتی

ڈر جو رسوائی کا ہوتا نہ کبھی ، جانِ غزل
ایک اک شعر میں تصویر تمھاری ہوتی

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں گر سو سکتا
میرے ہر خواب کی تعبیر تمھاری ہوتی

قوس اور دائرے ہونٹوں کے ترے لکھ سکتا
میرے اشعار میں تاثیر تمھاری ہوتی

چوتھی کھونٹ

رات کے گہرے سنّاٹے میں
ہولے ہولے دِھیرے دِھیرے
میرے پاس چلا آتا ہے
بُھولا بھٹکا سا اِک لمحہ
اُن وقتوں کی کھوج میں
جب کہ
ایک ہنسی نے روک کے رستہ
میرا سب کچھ چھین کے مجھ سے
مجھ کو گم صم چھوڑ دیا تھا

لیکن اُس بھولے لمحے کو کون بتائے
میں بھی اِک دن
کھوج میں اُن وقتوں کی
چاروں اور پھرا تھا
جانے انجانے میں چوتھی کھونٹ مُڑا تھا
چلتے چلتے
کانوں میں پھر اُس ہنسی کی چاپ پڑی تو
میں نے مڑ کر دیکھ لیا تھا
تب سے اب تک
میں پتھر ہوں

فرار

تو کیوں نہ
ذات کی پاتال میں جا کر
اندھیرا اوڑھ لوں
اور ایسے چھپ جاؤں
کہ میری ذات سے باہر کے
یہ آسیب، ڈر اور خوف سارے
چھوڑ دیں پیچھا مرا

سبز قدم دن

سبز کچُور سا دن تھا وہ جب
گہری نیلی سوچ کے آنسو پھولوں کو پُرسا دیتے تھے
سبز کچور سا دن تھا وہ جب
سانسیں رَستہ بھولی تھیں اور...... باتیں ساری گُنگ ہوئی تھیں
سبز کچور ہی دن تھا وہ بھی
سوندھی، گیلی مٹی نے جب
تیرے میرے شہر کا سورج گود لیا تھا

(جو ہر میر کے لئے)

انتظار کا لمحہ ، رَت جگوں سے باندھا ہے
سانس کا سِرا گویا ، واہموں سے باندھا ہے

اپنی سب دُعاؤں کو لکھ دیا ہے ساحل پر
اور ٹُوٹی کشتی کو پانیوں سے باندھا ہے

ہار جیت کی بازی زلف ہے چَلیپا سی
کھیل ہے مُقدر کا ، ظلمتوں سے باندھا ہے

خواب کے جزیروں میں بے اماں ہواؤں نے
کج ادا چراغوں کو وحشتوں سے باندھا ہے

مُضطَرب سے لمحوں میں ہم نے دل کی ٹہنی پر
ایک زرد سا پتہ اٹکلوں سے باندھا ہے

جبر ہے یہ موسم کا، ہم نے اِن دِنوں ناصر
یار کی گلی جانا فُرصتوں سے باندھا ہے

بچھڑنے والے کو کیا کیا صَدائیں دیتا ہوں
میں روز و شب اُسے ناصر دُعائیں دیتا ہوں

یہ حوصلہ مجھے بخشا ہے عِشق نے تیرے
پرانے زَخموں کو تازہ ہوائیں دیتا ہوں

لبوں پہ یوں تو سدا تیرا نام رہتا ہے
مگر وہ لمحہ ، کہ خود کو صدائیں دیتا ہوں

کبھی تو خود سے کسی بات پر خفا ہو کر
میں تیرے نام پہ خود کو سزائیں دیتا ہوں

قبول ہوں، تو یہ دنیا ہو تیرے قدموں میں
نہ پوچھ تجھ کو میں کیسی دعائیں دیتا ہوں

میں جی رہا ہوں نہ مرتا ہوں پیار میں ناصر
میں شمعِ جان کو ایسی ہوائیں دیتا ہوں

کھلا کہ ہجر سی لذّت دمِ وصال نہیں
سو اب کے تیری جدائی کا کچھ ملال نہیں

خُمارِ دانۂ گندم بھی مست رکھتا ہے
فَقط نگار کی آنکھوں کا کچھ کمال نہیں

یہ شام لمحوں میں کیسا ہے انتظار مجھے
جب آنے کا کسی رادھا کے احتمال نہیں

مثالِ آتشِ خُفتہ خَموش حُسن ہے وہ
سو چہرہ چاند نہیں چشم بھی غزال نہیں

یہ سارے جھوٹے فسانے یہ من گھڑت قصّے
کہانی کیسی کہ تُو مرکزی خیال نہیں

سَفر کا موڑ ہے کیسا یہ کیا علاقہ ہے
کسی بھی چہرے پہ لکّھا کوئی کمال نہیں

غلام گردشیں اَب بھر گئی ہیں شاہوں سے
سو اس کی پہلے تو تاریخ میں مِثال نہیں

عُدو کے سامنے ناصر ہوں حوصلہ پہنے
زِرہ بدن پہ نہیں ہاتھ میں بھی ڈھال نہیں

وہ جو اِک لَفظ کہ خسارہ ہے
میرے ہونے کا اِستعارہ ہے

نادہندہ میں ہر جگہ ٹھہرا
زائچہ ہے کہ گوشوارہ ہے

اِک دَریچے نے ہم کو بتلایا
اِس گلی میں کوئی ہمارا ہے

داغ سینے میں جھلملاتے ہیں
کوئی جگنو کوئی ستارہ ہے

آخری موڑ ہے سفر کا اب
آسمانوں سے اِک اشارا ہے

رَت جگے یوں بھی کم نہ تھے ناصر
پیار سے اُس نے پھر پُکارا ہے

برسات تو ناصر ہے مری موت کا پیغام
دیواروں پہ لکھی میں عبارت کی طرح ہوں

شکستہ پائے مسافت دہائی دیتے ہیں
کہ منزلیں نہیں ، رَستے جدائی دیتے ہیں

قفس میں دل کو لگایا ہے دِقتوں سے تو اب
عجیب لوگ ہیں اذنِ رہائی دیتے ہیں

میں دشمنوں کے ستم حرف حرف کہہ دوں گا
مگر وہ کیسے کہوں دُکھ جو بھائی دیتے ہیں

نظر اُداس ہے میری کہ رُت اداس ہوئی
ملول چہرے ہی ہر سو دکھائی دیتے ہیں

تو کیوں نہ اُوج پہ قسمت کا آج سورج ہو
وہ میرے ہاتھ میں دستِ حنائی دیتے ہیں

اُنہیں بھی ناز بہت اپنی دین پر ہوگا
پہاڑ غم میں جو راحت کی رائی دیتے ہیں

سکوتِ شہر کے کانوں میں آج پھر ناصر
اِک انقلاب کے نعرے سنائی دیتے ہیں

کہنے کو جو یوسف سرِ بازار گیا ہے
اس قصّے میں تو مِصر کا کردار گیا ہے

اس دورِ پُرآشوب میں ہر سانس قیامت
سایہ بھی سمٹ کر پسِ دیوار گیا ہے

سب دانش و پندار جہاں ہوتے ہیں نیلام
اُس سَمت لئے قافلہ' سالار گیا ہے

کس برتے پر امید رکھوں اُس سے وفا کی
دستار کو جو بیچ کے دربار گیا ہے

پانی بھی ہے زوروں پہ مری ناؤ بھی ٹوٹی
پر حوصلہ لے کر مجھے اُس پار گیا ہے

ہنستے ہوئے کرتا ہے جو غیروں سے وہ باتیں
یہ طرزِ تکلّم تو مجھے مار گیا ہے

بشرطِ اُستواری

شگفتہ سا وہ اِک چہرہ
کہ کل تک تازگی کا اِستعارہ تھا
بہت ویران اور اُجڑے دلوں کا جو سہارا تھا
وہ جس کی آنکھ کی جُنبش سے جیسے سب
ستارے پھول کلیاں اور جگنو سانس لیتے تھے
کبھی جو اُس کے ہونٹوں پر
دِیئے مُسکان کے جلتے
تو جیسے ہر طرف اِک روشنی سی پھیل جاتی تھی
سو، سرشاری کا موسم بزم میں اس طور چھا جاتا
کہ خود سے بات کرنے کی ہر اِک کو اُس

بھری محفل میں اِک عادت سی پڑ جاتی
اور ان باتوں میں ان گلنار ہونٹوں کے،
اداؤں کے
گھٹا زُلفوں کے، جادوئی سی آنکھوں،
چاند چہرے اور
سِتارہ سی جَبیں کے تذکرے ہوتے
مگر یہ بات......کل کی ہے
کہ جب وہ اِک شگفتہ موہنا چہرہ
علامت تازگی کی حُسن کا اک اِستعارہ تھا
بہت ویران اور اُجڑے دلوں کا جو سہارا تھا
کہ اب تو وقت کی صَرصَر نے شمعیں حُسن کی
ساری بجھا دی ہیں
اور اب......ویران سی آنکھیں ہیں پھیکے ہونٹ ہیں
اور ان سیہ زُلفوں کے بادل خود ہی پیاسے ہیں
بھری محفل......جو کل تک شور سے آباد رہتی تھی

وہاں اب ہُو کا عالم ہے
مگر میری نگاہیں ایک لمحے کو بھی
اُس چُپ چاپ پژمُردہ سے چہرے سے نہیں ہٹتیں
سوالوں سے بھری اُن اجڑی آنکھوں سے
میں اب بھی روشنی لے کر اُمیدوں کا نگر تعمیر کرتا ہوں
اُسی دہلیز سے اب بھی سفر آغاز کرتا ہوں
مجھے اِس سے غرض کیا ہے
کہ گردِ روز و شب نے اُس کے وہ تیکھے سے خال و خط
چُھپا ڈالے
بُجھا ڈالے
مٹا ڈالے
کہ میں تو اس قدر ہی جانتا ہوں اور اتنی ہے خبر مجھ کو
محبت موسموں اور وقت کی ترتیب سے آزاد ہوتی ہے
بہت برباد کرتی ہے
تو خود آباد ہوتی ہے

روٹین

نئے سورج کے اُگنے سے
میں پہلے ہی سفر آغاز کرتا ہوں
کہ خود سے روٹھنے کو
اور منانے کو
کہ خود سے بات کرنے کو
کئی قصّے سُنانے کو
گذرتی رات اور دن کے
اُجالے کے حسیں سنگم سے بہتر
کون لمحہ ہے

ہائیکو

اَب پچھتانا کیا
اُس کی آنکھیں نیلی ہیں
پہلے سوچنا تھا

○

برف تو لگتا ہے
لیکن لمس یہ پہلا ہے
آگ لگا دے گا

○

سچا شاعر ہے
پیارے پیارے سب چہرے
اُس کی غزلیں ہیں

مرے موسم تری آب و ہوا میں سانس لیتے ہیں
کہ بچّے جس طرح ماں کی دُعا میں سانس لیتے ہیں

پرندے شاخ پر نقلِ مکانی سے ذرا پہلے
پروں میں دے کے سر آہ و بُکا میں سانس لیتے ہیں

ترے حلقے سے نکلیں گے تو خود سے روٹھ جائیں گے
تری خوشبو سے خالی کس فضا میں سانس لیتے ہیں

چلو میں بھول جاتا ہوں چلو تم یاد مت کرنا
چلو اب زَعم میں اپنی اَنا کے سانس لیتے ہیں

کبھی جب گاؤں کی میٹھی سی چھاؤں یاد آ جائے
عجب اک عرصۂ کرب و بلا میں سانس لیتے ہیں

سحر ہونے سے پہلے دار پر کھچ جانا ہے ناصر
کہ ہونا جرم ہے اور اِس سزا میں سانس لیتے ہیں

پھر ٹپکتا ہے اِن آنکھوں میں لہو رات گئے
میری سوچوں میں جو در آتا ہے تُو رات گئے

ہجر کی رات شبِ وَصل سے بڑھ کر گذرے
چاک سینے کے جو کرتا ہوں رفُو رات گئے

دوست دن بھر تو میں ہوتا ہوں سبھی کا لیکن
آپ بن جاتا ہوں میں اپنا عدُو رات گئے

کس طرح جلتا ہے یادوں کے الاؤ میں بدن
تو بھی ٹک دیکھ اِدھر آ کے کبھو رات گئے

سوچتا ہوں کہ بسر رات وہ کیسے ہوگی !
خار بن جائے گا جب ہر سرِ مُو رات گئے

یاد ہے پہلی محبت کی پرستش ناصر
جب کہ کرتا تھا میں اشکوں سے وضو رات گئے

کسی کے وعدے پہ گذری ہے میری شام تمام
دھرا ہی رہ گیا اب کے بھی اہتمام تمام

تجھے پانا ضروری یا کہ پھر کھونا ضروری ہے
ضروری ہے نہ ہونا یا مرا ہونا ضروری ہے

محبت نے نہ بدلا وقت پر رستہ تو یوں ہے اب
کبھی جو اختیاری تھا وہی رونا ضروری ہے

تم اپنی نیند سے کہہ دو کبھی فرصت میں آ جائے
ملاقاتوں کی راتوں میں بھلا سونا ضروری ہے

ترے ہونٹوں پہ میرے نام کا اک پھول کھل جائے
تو مجھ کو بھی یقیں آئے مِرا ہونا ضروری ہے

بہت نفرت کی فصلیں کاٹ لیں برباد ہو بیٹھے
محبت کا دلوں میں بیج اب بونا ضروری ہے

اَدھورے کام ہیں کتنے مگر اِک دو تو ایسے ہیں
دمِ رُخصت سے جن کا پیشتر ہونا ضروری ہے

علاج کرتا رہا دل کا چارہ گر لیکن
قضا کا تیر ترازو مرے جگر میں رہا

بس ایک بار ہی احباب سے تھا ذکر کیا
پھر اُس کے بعد مسلسل وہی خبر میں رہا

بس ایک پل کو مجھے سوچتا میں آ جاتا
کہ تجھ سے دور تھا لیکن ترے اثر میں رہا

جبھی تو دل نے نئے مشغلے تلاش کیے
جدائیوں کا ہر اک پل مری نظر میں رہا

گیت

حُسن کے اُونچے سِنگھاسن پر گوری تیرا روپ
تو صبح کی شِیتل چھایا تو جاڑے کی دھوپ

تُجھ سے موسم خوشبو مانگیں تجھ ہی سے وہ رنگ
اِس دھرتی آکاش کے سارے جادو تیرے سنگ

تیرے ماتھے جھلمل بندی ، کاجل اُوڑھیں نین
جیسے سُندر جیسے مُوہن پُورن ماشی رین

جب تو اپنی چھت پر جا کر بالوں کو لہرائے
ساون بھادوں کوئی بھی رُت ہو جل تھل مینہ برسائے

تیری باتیں دو سُخنے ہیں کون مجھے سمجھائے
تیرا بھیتر ایک بُجھارت جو بوجھے سو پائے

تاثیر

کبھی سنگھار کرتی ساعتوں میں
تم بھی آئینے سے
اپنی آنکھ میں ٹھہرے ہوئے بھیگے سے
اِک موسم کی جب تفسیر پوچھو گی
تو آئینے کی حیرانی سے پہلے ہی
لبوں پر اُس گھڑی بے ساختہ
جس نام کا تارا سا اُبھرے گا
شفق کی سرخیاں گالوں میں بھر دے گا
جبیں کو ہم نشیں زہرہ کا کر دے گا

اور ایسے میں
تمہیں خود پر بہت ہی پیار آئے گا

سو جب
چپکے سے تم نظریں جھکا کر
آئینے کو چوم لوگی تو
اُسی لمحے...... یقیں جانو
میرے سُونے سے کمرے کا دریچہ
ارغوانی رنگ کے پھولوں سے
جیسے بھر سا جائے گا

چوتھی ہجرت

مَحبت اُپسرا بن کر
جب اُس کا دل لبھاتی تھی
ہوا بھی خوشبوؤں کے بوجھ سے
رُک رُک کے چلتی اور ٹھہرتی
اُس کو تکتی تھی
مگر وہ بے خبر اِن
نُورژوا سوچوں سے بھی کوسوں پَرے
حدِ نظر سے بھی ذرا آگے
کسی کی بھیگی پلکوں کے لئے
کچھ خواب چُننے خارزاروں پر

کہانی کی معیّت میں نکل کر
پاؤں کے چھالوں سے اپنی ڈائری ترتیب دیتا تھا
یوں ہی دن رات کٹتے تھے یوں ہی موسم بدلتا تھا
مگر اک دن...... کہانی نیند سے جاگی تو یہ دیکھا
کہ اُس کی ''تیسری ہجرت'' کا وہ البیلا ساتھی
اِک نئی ہجرت کی پہلی صُبح کو اوڑھے
بِنا کچھ بھی کہے نابود کی لمبی مسافت پر روانہ ہو چکا تھا
تب کہانی بال کھولے بین کرتی پھر سے اِک اندھی گلی میں لوٹ آئی ہے
(اعجاز راہی کے لئے)

سین ریو

ہنستا رہتا ہے
کیا جانے وہ دنیا کو
چھوٹا بچہ ہے

○

رات اندھیری ہے
جگنو نے تتلی سے کہا
کیسے گھر جاؤں

○

کس نے بھیجا ہے
چڑیا آنگن میں پوچھے
دلہن کیسی ہے

کتا بیٹھا ہے
بلی کے بھاگوں چھینکا
ٹوٹا بھی تو کیا

○

رستہ روکا ہے
سانپ کی نانی نے
گھر میں بین بجا

○

چاند کی نگری سے
تاروں کی بارات چلی
نیچے نہ آ جائے

اَب بِساطِ وقت پر شاید تماشا اور ہو
گرنے والا اور ہو اور اُٹھتا پردہ اور ہو

جس کی آنکھوں میں تھے رقصاں موسموں کے پھول سب
کیا خبر اب رُت بدلنے پر نظارا اور ہو

جب مرے نزدیک آئے گا وہ یارِ مہرباں
زندگی شاید یہی ہو پر تقاضا اور ہو

خواب کو تعبیر میں الجھا کے ہم جیتے رہے
اب یہ دل کہتا ہے جینے کا بہانہ اور ہو

بادباں نے چھپ کے کرلی ہے ہوا سے دوستی
دیکھئے اَب موڑ اگلا کیا دکھاتا اور ہو

اور تھوڑی دیر گھر جانے کی باتیں چھوڑ دو
کون جانے کس گھڑی ہم کو اِشارا اور ہو

''در و دیوار پہ حسرت کی نظر'' سے پہلے
کیوں بدن چُور ہوا میرا سفر سے پہلے

بعد میں نکلی ہے جاں اس جسدِ خاکی سے
چند تصویرِ بتاں نکلی ہیں گھر سے پہلے

اَب تو ہر شخص نے چہرے پہ لہو پہنا ہے
کون مَقتل میں تھا اس خاک بہ سَر سے پہلے

اَب جو آبادِ محبت ہوں ، تھا برباد بہت
بُور آتا ہے شجر پر بھی ثمر سے پہلے

اب بھی سنتا ہوں وہ آواز تو کِھل اٹھتا ہوں
اب بھی دل جُھکتا ہے اُس در پہ نظر سے پہلے

جو نہ کرنا تھا محبت میں وہی کر گذرے
رہن رکھ دی ہے اَنا کاسۂ سَر سے پہلے

کیا میں آئندہ کو ماضی کی گواہی دوں گا
اُس نے کاٹی ہے زُباں دستِ ہُنر سے پہلے

مُسلسل دستکیں سی ہو رہی ہیں
یہ دل سینے میں اب گھبرا گیا کیا؟

چُھپاتے پھر رہے ہو ہم سے نظریں
سوا نیزے پہ سورج آ گیا کیا؟

ستارہ کیوں سرِ مژگاں ہے چمکا
قیامت حال میرا ڈھا گیا کیا؟

تمھاری آنکھ میں ویرانیاں ہیں
تمہیں بھی وقت یہ ترسا گیا کیا؟

مرے سرہانے دَم سادھے کھڑے ہو
مَحبت کا یقیں اب آ گیا کیا؟
(CCU میں)

مَحبتوں کے مراحل کے باب رہنے دو
کتاب کافی ہے بس ' اِنتساب رہنے دو

میں بے ہنر ہوں تو یوں ہی سہی ،چلو تم ہی
ثواب سارے سمیٹو ، عذاب رہنے دو

ملے گا کچھ بھی نہ تم کو بجز پشیمانی
یہ دور ایسا ہے سب اپنے خواب رہنے دو

امیر شہر کی خواہش کا احترام کرو
حقیقتوں کو چھپاؤ سراب رہنے دو

تمھارے بارے کہا کچھ بھی ہو تو مجرم ہوں
''حسابِ دوستاں در دل'' حساب رہنے دو

رِفاقتوں کے سفر کا یہ موڑ ایسا ہے
سوال سنتے رہو تم جواب رہنے دو

میرے اُجڑنے میں کس کس کا ہاتھ ہے ناصر
یہ بات رہنے دو ، عالی جناب رہنے دو

وہ ایک لمحہ کہ ادراکِ ذات ہوتا ہے
تو ایک ذرّہ بھی پھر کائنات ہوتا ہے

سو اَسپ و فیل کو بازی میں شہ جو پڑ جائے
تو اِک پیادہ بھی پھر وجہِ مات ہوتا ہے

میں اپنی ماں کی دعاؤں کو اوڑھے رہتا ہوں
ہمیشہ سر پہ مرے اُس کا ہاتھ ہوتا ہے

عجیب میٹھی سی چھاؤں میں دن گزرتے ہیں
جہاں بھی جاؤں میرا گاؤں ساتھ ہوتا ہے

اُردو ٹپے

☆ مَحبتوں کا یہ سفر ہے
ہر اِک قدم پہ نئی منزلیں دکھائے

☆ ساری دنیا سے چھپ چھپا کے
وہ ننگے پاؤں میرے پاس دوڑی آئے

☆ اُس کے گھر پانی آ گیا ہے
میں ہوں پنگھٹ پہ دِیئے آس کے جلائے

☆ اُس نے جب لال جوڑا پہنا
تو میرے دل میں کئی وسوسے سے آئے

☆ وہ اگر مجھ کو چاہتی ہے
تو میرا نام ہتھیلی سے کیوں مٹائے

☆ میں اندھی شب کا مسافر ہوں
مرے اعصاب پہ وہ چاند بن کے چھائے

☆ جھٹک دے رُخ سے وہ جب زلفیں
تو بدلیوں میں حسیں چاند بھی چھپ جائے

☆ اُسے تو یاد بھی نہیں ہے
میں جھوٹے وعدے پہ اب تک ہوں گھر سجائے

☆ تو نے کھڑکی جو بند کر لی
یہ کم نصیب ترے دَر سے کہاں جائے

☆ تُو پھیر لے جو مجھ سے آنکھیں
تو اِک ستارہ سا پلکوں پہ جھلملائے

شبِ فراق خیالِ وصال گُم گُم ہے
یہ اور بات طبیعت بحال گُم گُم ہے

جو ایک رَسم چلی تھی مزاج پُرسی کی
کبھی بہت تھی مگر اب کے سال کم کم ہے

نظر کے پاس مگر دل سے دُور تھا ایسا
بچھڑنے والا ہے لیکن ملال کم کم ہے

یہاں کی صبحِ طرب شامِ غم کی ہے صورت
کہ زخم ہنستے ہیں اور اِندمال کم کم ہے

بس اپنی دُھن میں برستا ہے برسے ہی جائے
اُجڑنے والے دِلوں کا خیال کم کم ہے

لو اب تو کُھل گئی خوش قامتیٔ یاراں بھی
کہ بولتے تو سبھی ہیں کمال کم کم ہے

بچھڑ کے مجھ سے وہ کھو بیٹھا تازگی ناصر
جمیل اب بھی ہے لیکن جمال کم کم ہے

کیوں کوئی گِلہ ہوتا، مل کے جو گیا ہوتا
کم سے کم جُدائی کا زخم تو ہرا ہوتا

حوصلہ یہ میرا ہے ہجر میں بھی زندہ ہوں
جاں سے وہ گذر جاتا کوئی دوسرا ہوتا

میں وہیں چلا جاتا بے کلی جو بڑھ جاتی
اُس گلی سے اتنا تو میرا رابطہ ہوتا

شعر میں بھی کہہ سکتا اِک کتاب ہو جاتی
اور غزال آنکھوں کا اُس پہ تبصرہ ہوتا

خواب سے جزیروں میں بھیگتے ہوئے پھرنا
بارشوں کے موسم میں ایسا سلسلہ ہوتا

حریف لے اُڑے اُس کو لگا کے باتوں میں
میں بے ہنر تھا میری اَن کہی نمایاں تھی

مٹی مٹی سے لکیریں تھیں اس ہتھیلی میں
مرے خلاف جو تھی بس وہی نمایاں تھی

ہوئی ہے یاد سے تیری یہ خاص عام سی شام
وگرنہ یوں ہی میں پھرتا اُداس عام سی شام

ابھی تو آنے میں تیرے تھے چار دن باقی
یہ کیسے پھیل گئی تیری باس عام سی شام

کبھی تو شامِ غریباں بھی حوصلے سے کٹے
کبھی تو گھیر لے دل کو ہَراس عام سی شام

مِلن رُتوں میں تو اکثر میں تشنہ کام رہا
مگر ملیں مجھے بھر بھر گلاس عام سی شام

یہ ''روزِ ابر و شبِ ماہ'' کا زمانہ نہیں
کہ اب تو اور بھی بڑھتی ہے پیاس عام سی شام

دیا جلائے کُھلے دَر میں بیٹھا ہوں ناصر
کہ جیسے آئے گا وہ میرے پاس عام سی شام

نہ تیرے در کا نہ اپنے ہی گھر کا رہنے دیا
کیا ہے کیسا یہ ہم سے ترے جہان نے ہاتھ

چلاؤں تیر میں جو بھی وہ آئے میری طرف
تو گویا جان لیا ہے کڑی کمان نے ہاتھ

اُگی تھی بھوک ہی ہر سو تو فصل کاٹنے سے
بڑی اداسی سے کھینچا مرے کسان نے ہاتھ

کسی سے بند نہ ہو پائیں جب کھلی پلکیں
تو رکھ دیئے مری آنکھوں پہ مہربان نے ہاتھ

عجیب دیدنی منظر تھا شامِ آمدِ یار
گلی میں سینے پہ رکھے تھے ہر مکان نے ہاتھ

گلزار کے لئے

بہت گہری اُداسی کے
حصارِ بے اماں میں
زندگی...... اندھی گھپاؤں میں
کبھی لمبی مسافت پر۔ برہنہ پا جو چلتی ہے
تو ہونٹوں پر مرے اک نام کا تارا اُبھرتا ہے
''مرا* گلزار''
(وہی گلزار کہ جس کو کبھی دیکھا نہیں ہے رُوبرو میں نے
مگر شاید جسے دیکھا بہت ہے جان اور پہچان کے سارے حوالوں سے)

ستانوے

تو جب اس نام کا تارا اُفق پر میرے ہونٹوں کے
اُبھرتا ہے
تو پھر یکبارگی چاروں طرف میرے
عجب اک ارغوانی روشنی سی پھیل جاتی ہے
تمنا پھر مچل کر اُس سمے کانوں میں سرگوشی سی کرتی ہے
کبھی وہ سامنے آئے تو اُس سے اِس قدر پوچھو
کہ...... اِن بے جان حرفوں اور اِن پھیکے سے لفظوں سے
بھلا وہ کس طرح یہ شوخ و شنگ شکلیں بناتا ہے
قلم مُرلی کی تانوں سے
زمانے کو نچاتا ہے

* گلزار: گیت نگار

بہت ہی کم سہی ساغر میں بادہ، ہے تو سہی
سو خود سے ملنے کا اِس شام وعدہ ہے تو سہی

یہ اور بات کہ تم اِس میں رہ نہیں پائے
پہ شش جہت سے مرا دل کُشادہ ہے تو سہی

نہ جانے کون پڑاؤ پہ شب سے ملتے ہیں
کہ آج شام سفر کا ارادہ ہے تو سہی

کھنکتے لفظوں کے سکّے ہیں بزم میں تیری
گرہ میں اپنی بھی اِک حرفِ سادہ ہے تو سہی

غزل میں بات نئی کتنی بھی کہیں ناصر
فقیرِ میر سے کچھ اِستفادہ ہے تو سہی

جلا کر رکھ دیئے ہیں خط کسی کے
یہ کیسا شخص ہوتا جا رہا ہوں

عجب خوش فہمیاں لے کر چلا تھا
سو ہر اک گام پر رکتا رہا ہوں

ترستی تھی سماعت جس سخن کو
اُسی آواز کو جھٹلا رہا ہوں

دھواں سا بھر گیا آنکھوں میں میری
تو کیا خود سے بھی اب اکتا رہا ہوں

یہ سناٹا ہے کیوں آنگن میں ناصر
جب آوازوں سے گھر بھرتا رہا ہوں

میں دیر تک اُسے ہر رات پڑھتا ہوں ناصر
وہ ایک خط جو ابھی تک مجھے ملا بھی نہیں

پانے کو تیرے ہم نے جتن کیا، کِیا کِئے
یعنی پرندے روز خریدے رہا کِئے

اَحباب جانتے ہیں وہ دیں گے گواہیاں
کیوں ہم نے جان بوجھ کے رستے جُدا کئے

چہرہ کسی دَریچے میں روشن نہیں ہوا
حالانکہ اُس گلی کے تو پھیرے بَلا کئے

ہم وہ کہ سات صدیوں میں سوئے نہ ایک پل
سِکّے نہ پھر بھی شہر میں اپنے چلا کئے

دہلیز سے تو اُس کی اٹھایا کبھی نہ سر
سجدے نہ تھے جو قرض ، سو وہ بھی ادا کئے

پہنچی نہ اپنی فِکر ورائے گُماں کبھی
اِس آسماں کے پار بہت ہم اُڑا کئے

پندار نے تو ہم کو کہیں کا نہیں رکھا
مُدّت ہوئی ہے اُن سے بھی اَب رابطہ کئے

خود سے بھی تو اب دوستی ناصر نہیں رہی
آئینہ کا بھی عُمر ہوئی سامنا کئے
(یومِ غالب)

قہرِ درویش

سَفر لاحاصلی کا
جب بھی مجھ کو خون کے آنسو رلاتا ہے
تو میں اَفسردگی کے زرد سے موسم میں کمرے سے
نکل کر آسماں سے بات کرتا ہوں
مگر...... میرے ہی قدموں میں میری آواز کی
زنجیر کی کڑیوں کی چھن چھن بڑھتی جاتی ہے
تو پھر میں اِحتجاجاً
آسماں سے رُوٹھ جاتا ہوں
اگرچہ علم ہے مجھ کو
کہ ایسا قہر تو درویش کی جاں پر ہی ہوتا ہے

کراچی

(جاگتی راتوں کا شہر)

اب شام سے سب
بند گھروں میں ہوئے ناصر
کیا وقت تھا
کہ شہر یہ
سوتا ہی نہیں تھا

ہائیکو

شام کے کُہرے میں
جب بے دم مرغابی گری
نیچے جھیل نہ تھی

O

ہجر کی بارش تو
کیچڑ سا کر دیتی ہے
اُجلے خوابوں کو

O

سگنل سبز تو ہے
آگے بڑھتا کوئی نہیں
سڑکیں خالی ہیں

O

پُھول ہمارے ہیں
پَربت، جِھرنے، ندیا بھی
پر، ہم کب اپنے

کل سے کیوں یہ آج ہے بدتر ، پہروں سوچتا رہتا ہوں میں
کب ٹوٹے گا چُپ کا پتھر ، پہروں سوچتا رہتا ہوں میں

جیسے شہر کے سب لوگوں کو ڈس گئی پیلے رنگ کی ناگن
زرد ہواؤں کا یہ چکّر ، پہروں سوچتا رہتا ہوں میں

رات کو اپنے کمرے میں جب تنہا سا میں رہ جاتا ہوں
کیا کیا مجھ پر بیتی دن بھر ، پہروں سوچتا رہتا ہوں میں

کیسے دن ہیں کیسی رُت ہے ہر چہرہ سہما سہما ہے
کب لاوا نکلے گا باہر ، پہروں سوچتا رہتا ہوں میں

جس سے ملنے کی خاطر پل پل تدبیریں سوچتا تھا میں
اب تو اُس سے مل کر اکثر پہروں سوچتا رہتا ہوں میں

محفل کی مجبوری تھی یا سچ مچ مجھ سے پیار تھا اُس کو
اُس کی بزم سے واپس آ کر، پہروں سوچتا رہتا ہوں میں

اُس بستی کے سارے باسی آنکھوں والے پھر کیوں ناصر
بانجھ صدائیں سوچیں بنجر ، پہروں سوچتا رہتا ہوں میں

شام ڈھلے اب لگتا ہے سب دھوکا تھا
صبح سویرے میں نے جو بھی سوچا تھا

جس کے سحر میں سانسیں گروی رکھی ہیں
وہ ساحر بھی دھوپ چڑھے کا سپنا تھا

وہ دو آنکھیں گھر سے جب ہمراہ چلیں!
پھر تو تپتا رستہ ، ٹھنڈا سایہ تھا

خود ہی شہر کی سمت مڑا تھا گاؤں سے
جانے پھر کیوں اُس کو مڑ مڑ تکتا تھا

خواہشوں کے حِصار میں رہنا
مُدّتوں کوئے یار میں رہنا

ایک وعدے کو اوڑھ کر سونا
اِک کے قُرب و جوار میں رہنا

زیست اپنی ہو حکم اُس کا ہو
اُس کے ہی اختیار میں رہنا

ہم پہ جو گزرے تم سدا جاناں
گنگناتی بہار میں رہنا

لاکھ بھٹکے اِدھر اُدھر لیکن
دل کو تیرے مَدار میں رہنا

گوشوارے میں سب خسارہ ہو
ہم کو اُس کاروبار میں رہنا

کارِ دنیا کے ہر جھمیلے میں
ہم کو پچھلی قطار میں رہنا

اِک عَجب شغل ہاتھ آیا ہے
رَت جگوں کے خُمار میں رہنا

وہ دیواریں اُگاتا ہے پہ دروازے نہیں دیتا
کسی کو اپنے گھر میں بھی تو وہ بسنے نہیں دیتا

دِکھاتا دور سے ہے دودھ کی اور شہد کی نہریں
مگر اُن تک پہنچنے کے کبھی ویزے نہیں دیتا

عجب ایک زَعم ہے اُس کو زمینوں پر خدائی کا
مری بستی میں مجھ کو پھولنے پھلنے نہیں دیتا

مرا رزق کشادہ تنگ کر دیتا ہے وہ پل میں
خلاف اپنے ہوا تک کو بھی جو چلنے نہیں دیتا

کسی کو دوست کہتا ہے تو وہ بھی کانپ جاتا ہے
کہ منزل تو دکھاتا ہے مگر رستے نہیں دیتا

غریبِ شہر کا دشمن فقیہہِ شہر بھی تو ہے
کوئی فتویٰ امیرِ شہر کے ڈر سے نہیں دیتا

اِک ایسا خوف اُس پہ موت کا طاری ہوا ناصر
کسی کو عالمی گاؤں میں اب جینے نہیں دیتا
(امریکہ عراق جنگ)

دوستوں سے دشمنی ہے
دشمنوں سے دوستی ہے

بے مزہ سی زندگی ہے
یعنی اک تیری کمی ہے

وقت کے کوہِ گراں پر
روز و شب کیا سعی کی ہے

کون سمجھے گا کہانی
کچھ کہی کچھ اَن کہی ہے

پھولوں کے کھلنے کا موسم ......

پھولوں کے کھلنے کا موسم
کوئی نہیں ہے
پھول تو جب بھی چاہیں
خالی دل کے سُونے سے آنگن میں
رنگوں اور خوشبو کے
میلے ایسے لگائیں
بُلبل، تتلی، جگنو
جن کو دیکھنے آئیں
کُو کُو کرتی کوئل ہو یا
دُور کے دیسوں سے کچھ ہجرت کر کے آنے والے
پیارے پیارے سارے پرندے،
خوابوں میں بھی ایسے میلے دیکھ نہ پائیں

میلے جو کہ
دل آنگن کی ڈالی ڈالی
پھول کھلائیں، دیئے جلائیں
وقت، مہینے، سال کی یا موسم کی قید نہیں ہے کوئی
جب بھی چاہیں رُوپ دکھائیں، رنگ سجائیں
پھولوں کے کھلنے کا موسم کوئی نہیں ہے
سچ کہتا ہوں
جب بھی ''اکتوبر کی پہلی''
یا پھر سال کے ''پہلے ماہ کی پچّیس'' آئے
پھولوں کے کھلنے کا موسم میرے آنگن در آتا ہے
آنکھوں کو اک جادوئی سی لَو دیتا ہے
میرا دامن خوشیوں اور
خوشبوؤں سے بھر جاتا ہے
پھولوں کے کھلنے کا موسم کوئی نہیں ہے

*سید ذیشان ناصر کا جنم دن......یکم اکتوبر

*افراز علی سید اور ابتسام علی سید کا جنم دن......۲۵ جنوری

دسمبر آخری سانسوں پہ ہے

نہ ہونا معتبر کب تھا
مگر اب ہو گیا ہے کہ
ہر اِک جانب اُسی کا تذکرہ ہے
اور اُس کا نام لے لے کر ہوائیں
آنگنوں میں بین کرتی ہیں
صدائیں سسکیاں بھرتے ہوئے
ہونے کے رستے روک لیتی ہیں

کہ اب ہونا بھی تو یوں ہے
کہ خود ماتم کُناں ہے
بال بکھرائے ہوئے، آشفتگی اوڑھے ہوئے
کہ اُس کے چار سو نابود ہی کی حکمرانی ہے
دسمبر بھی تو اپنی ...... آخری سانسوں پہ آیا ہے

(سونامی 2004ء)

یہ کیسے خوف کی پرچھائیوں میں زندہ ہوں
کہ اپنے گھر میں ہوں اور بھائیوں میں زندہ ہوں

فریبِ ماضی و آئندہ بھی ہے خوب مگر
گذرتے لمحوں کی دانائیوں میں زندہ ہوں

اسیرِ زلفِ مُعطّر ہوں ایک مدّت سے
شبِ سیاہ کی رعنائیوں میں زندہ ہوں

کبھی حیات کا نغمہ سنا نہیں پورا
کہ زندگی تری استھائیوں میں زندہ ہوں

یہ بام و دَر تو مرا سانس روک لیتے ہیں
سو اپنی ذات کی پہنائیوں میں زندہ ہوں

اُڑائے پھرتی ہے مجھ کو گراں گراں ناصر
میں اپنی فکر کی انگڑائیوں میں زندہ ہوں

تقریب تری یاد کی کمرے میں بپا تھی
میں صدر بھی ، سامع بھی تھا ، خود بول رہا تھا

اَحوال موسموں کا سمجھنا مَحال ہے
یعنی خزاں نصیب طبیعت نڈھال ہے

ہم جانتے بُتوں کو ہیں اور ان کے فیض بھی
کیا پوچھیں برہمن سے کہ یہ کیسا سال ہے

پہلے تماشا بزم میں ہم کو بنا دیا
پھر سادگی سے پوچھتے ہیں کیسا حال ہے

ملبوسِ سبز میں اُسے دیکھا تھا خواب میں
اب تک نگاہ میں وہی رنگِ جمال ہے

بازار میں سہی وہ کبھی پوچھتے تو ہیں
کیا کم کہ ہم فقیروں کا اُن کو خیال ہے

کیا ہجر کے دنوں کی شکایت کوئی کرے
اَب وَصل میں بھی کب یہ طبیعت بحال ہے

تھا نَرم دھوپ کا جو سفر ختم ہوگیا
اَب ہم ہیں اور قریۂ رَنج و مَلال ہے

کب پہلی بار تھا یہ رقیبوں کے سامنے
نظریں جو پھیر لیں تو اُسی کا ملال ہے

خواب و سَراب و وَہم و گُماں کا شمار کیا
''عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے''
(نذرِ غالب)

چاروں جانب جبڑے کھولے کالی بلاؤں کا سایا ہے
بے چینی کے خوابوں سے بھی جاگ کے میں نے کیا پایا ہے

جلتی بجھتی آشاؤں میں پیار کی رِم جھم کھو بیٹھا ہوں
جیون کی تپتی پگڈنڈی ، سر پر سورج کا سایہ ہے

دل آنگن کے پیڑ سے چڑیاں جانے کب کی جا بھی چکی ہیں
جسم کے اس گنبد کو پھر یہ کس کی صدا نے برمایا ہے

دھرتی ماتا کے آنچل کے تاروں کا بیوپار ہے ہر پل
کِس کِس کا میں نام بتاؤں اِک اِک میرا ماں جایا ہے

اپنے رُوپ کے چندرما کو گوری مت تو گہن لگانا
جیون کے لمبے رستے ہیں جانے والا کب آیا ہے

تیرے میرے جسم کی لکڑی کھا جائے گی وقت کی دیمک
پیار کی مستی حُسن کا جادو ، سب مایا ہے ، سب مایا ہے

جیسے اندھی شب میں ناصر ان دیکھے غاروں کا سفر ہو
جیون ایسا گورکھ دھندا اِس سے کس نے بھر پایا ہے

''جلتی ہوئی پیشانی'' پہ اِک ہاتھ بہت ہے
ہم گرم مزاجوں کو یہ خیرات بہت ہے

ویراں نظر آتی ہیں پہ سوکھی نہیں آنکھیں
تھوڑا سا دلاسا ہو تو برسات بہت ہے

پھر اپنا ہُنر آنکھ میں تا عمر بَسانا
ہو جائے جو اک بار ملاقات بہت ہے

آئیں گے بہت "غیب سے شعروں میں مضامیں"
جتنی بھی ہے فی الحال یہی بات بہت ہے

مت صبحِ جدائی کے سخن چھیڑیئے ناصر
چپ سادھ ہی لیجئے کہ ابھی رات بہت ہے

راستے رزقِ کشادہ کے بہت ہیں ناصر
کوئی اِس شہرِ پشاور سے جدا کیسے ہو

یہ چند سانسیں جو دی ہیں تو اِختیار بھی دے
کہ میرے ہونے کا اب مجھ کو اِعتبار بھی دے

تھکن بلا کی سفر سے ہے ، جسم ٹوٹتا ہے!!
شکستہ ناؤ کسی گھاٹ اَب اتار بھی دے

فلک کو پوری خوشی کب کسی کی بھاتی ہے
گلوں کو رنگ بھی خوشبو بھی دے تو خار بھی دے

کھلائے پھول کچھ ایسے کہ کھل اٹھا چہرہ
یہ رت ہے ایسی کہ اندر سے مجھ کو مار بھی دے

ترے ہی بس میں ہے خلّاق پالنے والے!
دِلوں کو چین بھی دے صبر بھی قرار بھی دے

......کے نام

اِک چاند کہ گردش کو کہیں بھول ہی آئے
اِک اَبر کہ مستی میں بَرستا چلا جائے

اِک نُور کہ ہم سے اُسے دیکھا نہیں جاتا
اِک عکس کہ روشن ہوئے جس سے سبھی سائے

اِک بھول کہ جیسے تری خوشبو کا حوالہ
اِک یاد کہ سوچوں میں مری پھول کِھلائے

اِک شعر کسی نے جو ابھی تک نہ کہا ہو
اِک نظم ترے حُسن کی تفصیل بتائے

اِک نیند بنے میرے گذشتہ کا حوالہ
اِک خواب کہ آئندہ کی تصویر دکھائے

اِک سوچ کہ سوچوں کو لگا دے مری گرہیں
اِک بات کہ چپکے سے کوئی لوری سنائے

اِک تارا کہ رخصت کے سمے اذنِ سفر دے
اِک اشک کہ رستے میں کوئی آگ جلائے

اِک تتلی کہ ملبوس چُرا لائی ہے تیرا
اِک پھول جو مہکے تیری خوشبو نظر آئے

اِک دھوپ کی ٹھنڈک سے ہُوا سرد میں ایسا
اِک چھاؤں کہ جیسے مجھے اندر سے جلائے

اِک چال کہ مستی بھی پڑے پاؤں پہ تیرے
اِک شال کہ کندھے سے سَرکتی چلی جائے

اِک خواہشِ ناکام اگر چھوڑ دے مجھ کو
اِک خواب کی تعبیر مجھے راہ سجھائے

اِک نظم کو میں کتنا سجاؤں کہ سنواروں
اِک شخص تو سمجھے نہ اشارے نہ کنائے

محفوظ کل کے لئے ایک دُعا

بہت سے گھروں سے بھرے اس نگر میں
مرا ایک چھوٹا سا گھر ہے
یہ مٹی کا گھر ہے......مگر اس کی مٹی سراپا گہر ہے
اَخوت مَحبت کی شبنم سے جیسے یہ گھر تَر بَتر ہے
زمیں ہے......مگر تا فلک معتبر ہے
یہاں تک کہ سورج بھی پہلی کرن کو اِدھر بھیجتا ہے
یہ مَشرق کے ماتھے کا جُھومر ہے نازاں بہت اپنی رَعنائیوں پر

اَنا پر بھی اور اپنے پندار پر بھی
خموشی پہ بھی اپنی گفتار پر بھی
کہ یہ جانتا ہے...... اسے یہ خبر ہے
کہ ماضی کے سفّاک لمحوں کے بے نام خوابوں کی
سرسبز و شاداب تعبیر ہے یہ
کہے اَن کہے کتنے پورے ادھورے سے قصّوں کی تفسیر ہے یہ
جوانوں بزرگوں کے زندہ لہو کے اُبلتے ہوئے سرخ ذرّوں سے تابندہ
رنگ اور انوار کی ایک تصویر ہے یہ
اور ایسی یہ تحریر ہے کہ
جسے وقت کے خوش رَقم اک مورّخ نے
سونے کے لفظوں سے حالات کی لوح پہ لکھا
اور اُس وقت لکھا...... بہت سوں کو جب یہ گماں بھی نہیں تھا
(یقیں بھی نہیں تھا)...... کہ یہ گھر بنے گا
مگر معجزہ یہ تو ہونا تھا، ہو کر رہا...... سب نے دیکھا کہ گھر بن گیا
اب اعتبار نام ہونے کا ہے تو

یہ گھر معتبر بھی ہے اور مستند بھی
کہ ہیں اس کی دِہلیز پر سر جُھکائے......ازل بھی ابد بھی
تو اے اِس کے اُجلے سویروں، سہانی سی شاموں کے مالک
مجھے وہ ہنر دے
کہ میں اپنے گھر کے مکینوں کی آنکھوں کو وہ روشنی دوں
کہ جس سے وہ اپنے ہر اک دکھ کو سُکھ میں بدل دیں
کہ وہ بے کل و مضمحل آج کو
ایک مضبوط اور محفوظ کل دیں

بُجھتا ہے کیسے جاں کا دِیا ' مجھ کو دیکھ لے
اے شہرِ بے وفا کی ہَوا ' مجھ کو دیکھ لے

کس طرح سے اتارا تھا مجھ کو زمین پر
کیا حال ہو گیا ہے مرا ' مجھ کو دیکھ لے

کاسہ لئے قطار میں کب سے کھڑا ہوا میں
اے کاش اُس کا دستِ عَطا ' مجھ کو دیکھ لے

سانسیں لبوں پہ رُک سی گئی ہیں تو اس لئے
شاید کہ مُڑ کے جانِ حیا ، مجھ کو دیکھ لے

میں روکتا نہیں ہوں تجھے عشق سے مگر
کیا کیا نہ میرے ساتھ ہوا ، مجھ کو دیکھ لے

میں نے کہا سکوں کو ترستی ہے یہ نظر
نظریں جھکا کے اُس نے کہا ، مجھ کو دیکھ لے

جگنو کبھی تِتلی کبھی خوش رنگ غُبارا
ہر دوسرے لمحے ہمیں بچپن نے پکارا

کس جیت کی امیّد پہ زندہ رہے کوئی
ہے کارِ محبت میں خسارہ ہی خسارہ

قِسمت کے دَھنی ہم بھی بھلا ایسے کہاں تھے
چُھپ جاتا جو سورج تو نکلتا کوئی تارا

وہ یار کے پہلو سے الگ ہی نہیں ہوتا
اِس ترکِ تعلق پہ مجھے جس نے اُبھارا

وہ مجھ کو سزا دے کے کڑی بھول گیا ہے
تنہائی کی سُولی سے کسی نے نہ اتارا

خطرے کا نشاں دیکھنے تب جاتے ہیں چھت پر
آنگن میں جب آجاتا ہے سیلاب کا دھارا

سورج سَوا نیزے پہ مگر اُس کا ہنر ہے
مِقیاس میں جِدّت کا چڑھا ہی نہیں پارا

اِس بھول کی بس اور سزا کتنی ملے گی
گذرے ہیں جو اک بار نہ گذریں گے دوبارہ

کچھ شہر کی شاموں میں بھی اِک سحر تھا ناصر
کچھ گاؤں کی صُبحوں نے بھی ہم کو نہ پکارا

سفر میں جب بھی دل مشکل مراحل کھینچتا ہے
ارادہ خود بخود پھر سوئے منزل کھینچتا ہے

عجب بے خانماں سی شام تھی زردی میں لپٹی
کہ اب تک درد اس کا ماہِ کامل کھینچتا ہے

جری ایسا کہاں تاریخ میں جو خوں سے اپنے
لکیر ایسی میانِ حق و باطل کھینچتا ہے

ثبوتِ زندگی دینے اجل کی خامشی میں
لو اک بیمار پھر شورِ سلاسل کھینچتا ہے

کنارِ آب جب چھلنی ہوا تھا اک پیاسا
سو رہ رہ کر یہ دریا رنجِ ساحل کھینچتا ہے

دیئے آنکھوں میں روشن یاد سے اُس کی ہیں ناصر
وہی اک غم جسے ہر روز یہ دل کھینچتا ہے

جلا چراغ تو مقتل میں سارے حاضر تھے
یہ جانثاری کا اُس شب تھا سلسلہ کیسا

بھیک جب مانگنے نکلوں گا تو در کتنے ہیں
پوچھ کاہن سے نئے سال سفر کتنے ہیں

کشتیٔ جاں ہے سلامت تو بھلا ڈر کیسا
کیسے طوفان ہیں ، دریا میں بھنور کتنے ہیں

رات ہے، ظلم ہے، بے کیفی ہے، بے چینی بھی
میں اکیلا ہوں مگر دیکھ اُدھر کتنے ہیں

جب ملے جنگ سے فرصت تو ذرا گن آ کر
فاختاؤں کے یہ جھلسے ہوئے پَر کتنے ہیں

ہجرتیں جب سے بنیں اپنا مُقدّر ناصر
اپنی بستی میں یہ بے نور سے گھر کتنے ہیں

❁

جو تیرے نام کا سورج اُجال رکھتے ہیں
ہم اپنے گھر کی سَجاوٹ کمال رکھتے ہیں

الگ سمجھتے ہیں جو فَرض کو عِبادت سے
ہم اُن کے سامنے تیری مثال رکھتے ہیں
(قائداعظم کے لئے)

تمھارے جسم کو چھو کر عجب شوخی دکھاوے ہے
نہیں تو عام سا یہ پیرہن کب دل کو بھاوے ہے

عجب اک دھوپ سی دیکھے سے تیرے اِس میں آوے ہے
وگرنہ رات دن یہ آنکھ تو پانی بہاوے ہے

کسو کو پاس تیرے دیکھ کر رگ رگ کھچی جاوے
کبھو دیکھو کہ پھر کس طرح سے دل خود کو کھاوے ہے

ہنسی سے یوں جلاوے ہے میری نمناک آنکھوں کو
بھری برسات میں جوں کوئی دیپک راگ گاوے ہے

لبوں پر آخری سانسیں تمہارا نام لکھے ہیں
تماشا ہے کہ خلقت دور سے دیکھے کو آوے ہے

میں ناصر جل اٹھوں گا دیکھ کر اُس شوخ کے جلوے
کہ اُس کے حسن کا شعلہ سبھی کچھ کو جلاوے ہے
(برنگِ قدیم)

ہائیکو

پیاسی آنکھوں میں
اک بوند نہیں پانی کی
سپنے سوکھے ہیں

○

موسم ساون کا
ٹپ ٹپ یادیں برسی ہیں
دل کے آنگن میں

○

میرا بیٹا اب
مجھ سے آگے چلتا ہے
کتنا خوش ہوں میں

جو چاہتے ہو اَمر دل کی چاہتیں رکھنا
وطن کے نام ہی ساری محبتیں رکھنا

جو راہِ حق میں کبھی دھوپ کا سفر آئے
تو معتبر سبھی جیون کی ساعتیں رکھنا

وطن سے پیار جو الزام بھی کبھی ٹھہرے
تو پورے فخر سے خود پر یہ تہمتیں رکھنا

زمیں جو ماں ہے تو ماں سے یہ نفرتیں کیسی
کہ اس سے رکھنا تو اعلیٰ ہی نسبتیں رکھنا

وطن کے جسم سے ناسور کاٹ پھینکے جو
قلم میں اپنے کچھ ایسی جراحتیں رکھنا

ہزار تلخ سہی میرے روز و شب ناصر
مگر لبوں پہ تو امرت صداقتیں رکھنا

اُسی کے عکس سے معمور ہیں حروفِ بیاض
پھر اُس کے نام بھلا انتساب کیا کرتا

نیا عہد نامہ

چلو اٹھو
کہ اپنے فیصلے خود آپ کرنے کی گھڑی آئی
ہمیں اب
''نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر''
یکجان ہونا ہے
ہمیں اپنے سروں پر ہاتھ رکھ کر
خود ہی اپنے آپ سے اِک حلف لینا ہے
نیا اِک عہد کرنا ہے

ہمیں اک دوسرے کے ہاتھ میں اب ہاتھ دے کر
اِک نئی زنجیر کی صُورت بنانی ہے
بہت تکیہ کیا اقوام عالم کے ادارے پر
کہ جس کو اِک بڑی طاقت کے زخموں کو
رَفو کرنے سے فُرصت ہی نہیں ملتی
(جسے کچھ بھی نہ کرنے کے صلے میں اَمن کا اِعزاز ملتا ہے)
سو ہم کو خود لہو میں تر کشیدہ قامتوں کے
سُرخ خوابوں کو ہری تعبیر دینی ہے
ہمیں دنیا کے نقشے کو نئی صُورت نئی تصویر دینی ہے
ہمیں تاریخ کے نامہرباں موسم میں
شفقت سے بھرے کچھ مہرباں لمحوں کو خود ہی کاشت کرنا ہے
اَذیّت کے سفر میں راستوں کو خون سے قندیل کرنا ہے
ہمیں جغرافیہ ...... تبدیل کرنا ہے

(یومِ کشمیر)

ایک اَن ہونی کا ڈر ہے اور میں
دَشت کا اندھا سفر ہے اور میں

مَشغلہ ٹھہرا ہے چہرے دیکھنا
اُس کے گھر کی رَہگذر ہے اور میں

بام و در کو نور میں نہلا دیا
ایک اُڑتی سی خبر ہے اور میں

حسرتِ تعمیر پوری ہو گئی
حسرتوں کا اک نگر ہے اور میں

جب سے اِک دیوار آنگن میں اُٹھی
اُس حویلی کا کھنڈر ہے اور میں

وقت کے پردے پہ اب تو رُوز و شب
اِک تماشائے دِگر ہے اور میں

جانے کیا انجام ہو ناصر مِرا
ایک یارِ بے خبر ہے اور میں

دل آنکھیں اور پتھر سائیں
اب ہیں ایک برابر سائیں

باہر پھول بہت ہیں لیکن
ویرانہ ہے اندر سائیں

ایک اک کر کے کٹ گئے سارے
میرے سرو صنوبر سائیں

ابرِ کرم کا کوئی چھینٹا
جھلسے ہیں سب منظر سائیں

دھوپ آندھی بارش کی زد میں
شہر میں اک میرا گھر سائیں

میرے اندر شور مچائے
چپ کا ایک سمندر سائیں

ہیرے موتی لوگ سمیٹیں
میرے حصّے کنکر سائیں

یار نہیں تو واپس لے لے
جو ہے آج میسّر سائیں

گھر کے رستے میں ایک صحرا ہے
پیار کا نام اُس کا دنیا ہے

کتنی مجبوریوں میں زندہ ہیں
کس قدر حوصلہ ہمارا ہے

تذکرہ تھا تیرے روّیے کا
ہم نے بھی کہہ دیا کہ اچھا ہے

آنچ تم تک ذرا نہیں پہنچی
لاکھ یہ دل ، جلا ہمارا ہے

چین ہی چین لکھتا ہے راوی
جانے کس دیس کا یہ قصہ ہے

بے مزہ وصل کو نہیں کرتا
وہ سخاوت کا ایسا دریا ہے

اُس کی مُسکان بولتی ہے بہت
کم سخن یار میرا ایسا ہے

مرے خیال میں اور میری جستجو میں رہے
علیؑ کا ذکر سدا میری گفتگو میں رہے

وہ جس نے ہونے کو میرے بھی اعتبار دیا
اُسی کا نام رواں نت مرے لہو میں رہے

جو بات ذات پہ آئے عدو کو چھوڑ سکوں
سبق امام کا شامل جو میری خو میں رہے

کبھی مدینہ کبھی میں نجف کی اُور چلوں
یہ دل دھڑکتا ہی بس ایسی آرزو میں رہے

مرا امام رہے مشکلوں میں ساتھ مرے
اُسی کے اِسم کی حدّت مرے لہو میں رہے

نجف کے شاہ کی یادوں کو اس طرح برتا
کہ اشک آنکھوں میں آئے نہیں گلو میں رہے

اک عام سے دن کو وہ مرے گھر ترا آنا
ہم چڑھتی جوانی کا خسارہ نہیں بھولے

جس ریت پہ مل جل کے بنایا تھا گھروندا
سچ بات وہ دریا کا کنارہ نہیں بھولے

رہ رہ کے جو رہ جانے کے کرتا تھا اشارے
ہم صبحِ سفر کا وہ ستارہ نہیں بھولے

روز و شب اب ہوئے عجب یعنی
زیست کرتے ہیں بے سبب یعنی

دل نے کب یوں ہی ہار مانی ہے
خوب رُسوا ہوا ہے جب یعنی

میری آنکھوں سے خود کو دیکھ کبھی
رت جگے کب ہیں بے سبب یعنی

سب سے ملتے ہیں کھیلتے ہنستے
ہم غریبوں پہ ہے غضب یعنی

کون آتا ہے بزم میں اُن کی
ہم نے پوچھا ہے اُن سے کب یعنی

وہ پشیماں تو لازماً ہوں گے
ہم نہیں ہوں گے جب تو تب یعنی

آنے والی نسل پر احسان ناصر یہ کیا
سچ بزرگوں سے نہ پایا لیکن اُن کو دے دیا

8 مارچ

جب آنچل پرچم بن جائے
روشن تارا بن کے عورت
دنیا سے خود کو منوائے

ایکسو باستو

اُردو ٹپے

☆ مجھے بے حال کر دیا ہے
یہ تیری یاد مجھے اس طرح رُلائے

☆ سہیلی تیری اِک پہیلی
جو بھیگی پلکوں سے قصّے ترے سنائے

☆ مرے ٹپوں میں چھپ کے بیٹھی
بڑے ہنر سے مجھے مجھ سے، ہی چرائے

☆ میں خود سے روٹھ روٹھ جاؤں
یہ تری باتیں کوئی اور جب سنائے

☆ یہ رُت عَجب ہے جُدائی کی
کہ اب تو پلکوں سے یہ خواب بھی چرائے

ایکسوتریسٹھ

ایک مُدّت سے ہوں میں سرِ بگریباں ناصر
زندگی شامِ غَریباں سی پریشاں ناصر

اتنا سمٹا ہے کہ میں یا ہے مرا آئینہ
کتنا پھیلا تھا کبھی حلقۂ یاراں ناصر

سب ہی بیساکھیاں نفرت کی لئے پھرتے ہیں
کتنا مفلوج ہے اس دور کا انساں ناصر

آسمانوں سے تو بس دھوپ صلیبیں اُتریں
اور زمینیں بھی ہوئیں صورتِ زنداں ناصر

خون آشام بلاؤں کی ہے زد میں دنیا
جانے کب اُتریں یہاں پیار کی پَریاں ناصر

شعر ہونٹوں پر لرزتا ہے ٹھٹھک جاتا ہے
کیسے اس شہر میں کوئی ہو غزل خواں ناصر

جاتے جاتے مُڑ کے جانے کس لئے تکتی رہی
سیدھی سادی ایک لڑکی نے مجھے الجھا دیا

صداقتوں کے سفر کی یہی کہانی ہے
جبینِ وقت پہ ہر نقش جاودانی ہے

سیاہ رُو کوئی ٹھہرا ہے سرخ رُو کوئی
یہ معرکہ تو ازل ہی سے امتحانی ہے

ہ جانتے تھے بھلا کیسے کرتے سمجھوتہ
ل و رَد میں کہاں بات درمیانی ہے

وہ ایک شام کہ ڈھل کر لہو سے نکھری تھی
اُسی کی آج بھی دنیا پہ سائبانی ہے

جو ایک لمحہ کو کاٹا بنی زبانِ امامؑ
تو بستیوں میں ابھی تک بھٹکتا پانی ہے

رہِ وفا و صداقت میں تب سے آج تلک
ہر ایک ذرّے کے لب پر وہی کہانی ہے

کہ جس نے ہونے کو انساں کے اعتبار دیا
مرے لہو میں اُسی نام سے روانی ہے

کبھی جو وقت کے ظلم و ستم سے گھبراؤ
علم اٹھاؤ ، یہی معتبر نشانی ہے

کیپ کاڈ

میری آنکھوں کو گدگداتا ہے
کیا عجب ''کیپ'' کا جزیرہ ہے

لوگ چپ چاپ سے گزرتے ہیں
حسن کا رعب ایسا دیکھا ہے

رنگ پتے بدلنے لگتے ہیں
جب ستمبر کا مینہ برستا ہے

یہ سمندر ، یہ شب یہ بھیگی ہوا
روح میں چاند سا اُترتا ہے

میرے پوروں میں اُس کا نیلا بدن
کسمساتا ہے ، مسکراتا ہے

گاہے گاہے تو چھو بھی لیتا ہوں
گاہے گاہے سراب لگتا ہے

''بیچ'' پر رنگ و نور کی بارش
ہر قدم دل ، فریب کھاتا ہے

جسم کے قوس و دائرے ایسے
سانس سینے میں رُک سا جاتا ہے

بے خبر کائنات سے ساری
خود میں کھویا وہ حسنِ سادہ ہے

یہ ہنر اُس کو کس نے سکھلایا
خواب آنکھوں میں ، جسم جاگتا ہے

مجھ کو لگتا ہے خواب کی صورت
خواب جو بار بار دیکھا ہے

''کاڈ مچھلی'' کی طرح دل بھی مرا
کیپ کی زلف میں الجھتا ہے

یہ *عتیق اور ''جوناتھن موٹل''
اک سمندر ہے اک جزیرہ ہے

اِن کے دم سے ہی رونقیں ساری
اِن کے دم سے ہی حسن سارا ہے

عمر جیسے تمام گذری یہاں
دل تو ماضی بھی بھول بیٹھا ہے

اب جو اِک خط ملا پشاور سے
نیند آنکھوں سے وہ چراتا ہے

خط میں لپٹی ہیں *شہر کی یادیں
بند اب ''کیپ'' کا دریچہ ہے

نوٹ: کیپ کاڈ امریکہ کی ریاست میساچوسٹ میں واقع ایک خوبصورت جزیرہ ہے۔
*عتیق احمد صدیقی (معروف دانشور و کالم نگار)
..پشاور

ٹپے

☆ میرے گاؤں کی ٹھنڈی چھاؤں
غموں کی دھوپ میں شہروں کی، یاد آئے

☆ میں خوشبوؤں میں بھیگ جاؤں
سفر میں دشت کے جب تیری یاد آئے

☆ تری آنکھوں کا بھیگا موسم
زمین دل میں عجب پھول سے کھلائے

☆ تری ہنسی کے صدقے جاؤں
بہت رُلائے مجھے جب بھی یاد آئے

☆ ہوائیں جھوم جھوم جائیں
تو اپنی چھت پہ کھڑی بال جب سُکھائے

میں کیسے مدحتِ سرکار میں زباں کھولوں
کہ کانپ اٹھتا ہوں وہ نام میں کبھی جو لوں

وہؑ شہرِ علم ہے مجھ پر بھی گر کرم کر لے
اُسی کرم ہی کے صدقے میں، میں بھی کچھ بولوں

مرے وجود کا کانٹا چمن پہ تہمت ہے
پھر اپنی آنکھ سے کس طرح پھول پھل، تولوں

پھر اپنی ذات کے پاتال سے نکل آؤں
میں ایک رات گناہوں پہ اپنے گر رو لوں

کہاں میں نعتِ رسولِ کریمؐ کے قابل
میں لاکھ کوثر و تسنیم سے زباں دھو لوں

ہوائے کوئے نبیؐ میرے دل کی بگیا میں
کبھی جو آئے تو میں اُس کے ساتھ ہی ہولوں

ہو دن کہ رات ذکر ترے چشم و لب کا ہے
اک سلسلہ عجیب مرے روز و شب کا ہے

بیعت کسی کے ہاتھ پہ اب کیسے میں کروں
مجھ پر صحیفہ پیار کا اترا تو کب کا ہے

ست کا میں تری کبھی منکر نہیں رہا
ب مگر یہ دور بڑے ہی غضب کا ہے

کی لُٹی تھی عزتِ سیّد اسی طرح
ر عشق پیشہ بھی میرے نسب کا ہے

ویلنٹائن ڈے

صُبح سویرے
آنگن میں اِک روز کے آنے والی چڑیا
آج بھی وقت پر آئی تھی
پر آج تو اُس نے
دانہ پانی یا چاول کو چُھوا نہیں ہے
بے چینی سے چُوں چُوں کرتی
اِدھر اُدھر پُھدکتی چڑیا
بھوکی پیاسی لوٹ گئی ہے......
آج اکیلی آئی تھی وہ

وہی منظر پرانا چاہتا ہے
پرندہ لوٹ آنا چاہتا ہے

سَلاسل رِزق کے پیروں سے باندھے
زمانہ آزمانا چاہتا ہے

زمیں سے ایک رِشتہ تو نہیں تھا
مگر دِل آب و دانہ چاہتا ہے

تھکن پیروں سے اٹھ کر دل سے لپٹی
سفر کوئی ٹھکانہ چاہتا ہے

خوشی کیسے ہو اُس سے جیتنے کی
جو خود ہی ہار جانا چاہتا ہے

یہ دل پچھلا خسارہ بھول بیٹھا
پھر اُس سے دوستانہ چاہتا ہے

یہ رَخشِ عُمر ہے رکنے پہ مائل
سو اَڑیَل! تازیانہ چاہتا ہے

بہت روتی ہے پُرکھوں کی حویلی
وہیں دِل لوٹ جانا چاہتا ہے

وہ سب الزام میرے نام کر کے
بچھڑنے کا بہانہ چاہتا ہے
(امریکہ)

تری یادوں کے جھولے میں جُھلا ہوں
میں چھوٹا ہو کے بھی سب سے بڑا ہوں

کسی کالر نہ بالوں میں سجا ہوں
میں خُودرو پھول جنگل میں اُگا ہوں

یہ کیسے موڑ پر چھوڑا ہے تو نے
قدم اٹھتے نہیں شل ہوگیا ہوں

تمھارے واسطے کیا کر سکوں گا
میں اپنے واسطے کیا کر سکا ہوں

وہ ایک رات کہ دیکھے تھے جس کے خواب بہت
جُدائیوں کے وہ لائی مگر عذاب بہت

مرے لبوں پہ بھی چپ ، تیری آنکھ بھی نم ہے
ملے جُدائی کے ہنگام اِضطراب بہت

یہ اور بات ، تیقّن سے بات کرتا ہوں
مرے وُجود میں پرچھائیاں ، سراب بہت

میں سوچتا ہوں یہ منظر عجیب منظر ہے
وہ میرے پاس مگر درمیاں حجاب بہت

کڑا بہت ہے محبّت کا امتحاں ناصر
سو پڑھتا رہتا ہوں اُس چہرے کی کتاب بہت

جستجو خواب کے جزیروں کی
نیند میں دیر تک چلا کرنا

اُس کی آواز اُس کی صورت سی
فون پر اُس سے رابطہ کرنا

بدن کے چیختے چلّاتے موسموں کے عذاب
سہے تھے ہم نے بھی اک دن یہ قربتوں کے عذاب

بصارتوں کو تو بے نور یوں بھی ہونا تھا
کہ پال رکھے تھے آنکھوں میں رت جگوں کے عذاب

کڑی تھی دھوپ تو کوئی بھی سائباں نہ ملا
لب میں دھوپ کی برسے ہیں بادلوں کے عذاب

جسے بھی دیکھئے ، لگتا ہے بھیڑیا بھوکا
لو اب تو شہر میں در آئے جنگلوں کے عذاب

کہ معتبر ہوئے موسم گواہی سے جس کی
اُسی پہ ٹوٹ کے برسے ہیں موسموں کے عذاب

میں اُس کو پا کے بھی فرقت میں جلتا رہتا ہوں
کسی نے دیکھے نہ ہوں گے یہ قربتوں کے عذاب

پشاور ریڈیو کے لئے ایک نظم

ایک صدا جو
کانوں میں سرگوشی کر کے
آنکھ میں حیرت بھر دیتی ہے
گاہے سن کر ہنس دیتا ہوں
گاہے چپ ہو جاتا ہوں میں
گاہے گاہے رو پڑتا ہوں
گاہے یہ آواز پکڑ کر میری انگلی
انجانے رستوں کی جانب چل پڑتی ہے
گاہے سرشاری کے سارے بھیگے موسم

میرے آنگن لے آتی ہے
بچپن کی ہمراز ہے میری
تنہائی کو گرماتی اور سانسوں کو مہکا دیتی ہے
مجھ کو مجھ سے ملواتی ہے
اِس کے دم سے نام پشاور کا ہے زندہ
یہ بھی زندہ باد رہے
شاد رہے آباد رہے

(72ویں سالگرہ پر)

جو نقش تھا مری آنکھوں میں کھو گیا مجھ سے
پھر اُس کے بعد یقیں بھی مجھے گمان لگا

کتنے مانوس جزیروں سے گذر جائیں گے
شام ڈھلتے ہی جو یادوں کے نگر جائیں گے

اپنے چہرے پہ لکھی تیری کہانی لے کر
کس طرح لوٹ کے ہم شام کو گھر جائیں گے

اوّلِ عشق میں کیا کیا نہ سنوارا خود کو
یہ بھی معلوم تھا آخر کو بکھر جائیں گے

مستقل بُعد سے دُھندلا گئیں یادیں تیری
اور کچھ دن میں یہ دریا بھی اُتر جائیں گے

کھیل بچپن کے ، لڑکپن کے بہت دلکش تھے
اُس زمانے میں کہاں بارِ دِگر جائیں گے

لاکھ دنیا سے ملیں بن کے ، سنور کے ناصر
اُس کے کوچے میں تو ہم خاک بہ سَر جائیں گے

ٹپے

☆ تری جب آنکھیں بولتی ہیں
قسم خدا کی کوئی بات کر نہ پائے

☆ تری پائل کی چھن چھنا چھن
تو جب چلے تو مرے ہوش یہ اڑائے

☆ تری باتوں کے سُر ہیں کومل
کہ بانسری پہ کوئی بھیرویں سنائے

☆ بوندا باندی کی بھیگی رُت میں
وہ پگلی سیکھنے ملہار چلی آئے

☆ تری پلکوں کی جھالریں جب
اٹھیں تو نبض سے کی بھی رُک سی جائے

وَصل کو خود کرے بَحال تو پھر؟
اب کے ایسی چلے وہ چال تو پھر؟

مُلتَفِت ہو کے پھیر لے آنکھیں
یعنی ایسا کرے کمال تو پھر؟

دل کے ہر گھاؤ میں زُباں رکھ دوں
کام آئے نہ عرضِ حال تو پھر؟

حال ہنس ہنس کے پوچھنے والو
سن کے تم کو ہوا ملال تو پھر؟

اب دیئے ٹھوکروں پہ رکھتے ہو
بجھ گیا قریۂ جمال تو پھر؟

شہرِ خُوباں ہے، لاکھ چہرے ہیں
کوئی پوچھے تری مِثال تو پھر؟

آج کی شام جُھوٹے وعدے پر
گر وہ آ جائے خوش خصال تو پھر؟

سو بھیدوں کی رات کا قصّہ
تیرے میرے ساتھ کا قصّہ

نیلی شام کی پیاسی رُت میں
رِم جھم کی برسات کا قصّہ

لطف پہ مائل ایک محبت
بھیگی بھاگی رات کا قصّہ

آنکھوں میں کچھ پیار کے ڈورے
ہونٹوں پہ جذبات کا قصہ

ملنے آنا ، روٹھ کے جانا
جیت ہی جیت میں مات کا قصہ

دل آنگن میں روشن اب تک
گہری کالی رات کا قصہ

ایک میلہ سا شب و روز غموں کا رہتا
دل کی اِک ایک گلی اتنی کشادہ تھی کبھی

اب تو دو چار قدم چلتے ہیں، تھک جاتے ہیں
زندگی تجھ سے بھی رفتار زیادہ تھی کبھی

غمِ جاں سے غمِ جہاں تک

نکتہ داں ، نکتہ طراز ، نکتہ سنج و نکتہ فہم
شانِ بزم و جانِ بزم و روحِ بزم و مردِ بزم

اگر کسی ادب شناس سے پوچھا جائے کہ ایسی شخصیت بتایئے جس پر اوپر کا شعر مکمل طور پر صادق آئے تو مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی معتدل ذہن اور عدل پسند زبان ایک ہی فیصلہ دیں گے۔ ''ناصر علی سیّد''

نوجوان شعراء کی ایک ادبی محفل میں ناصر کی پہلی غزل سنی تو اس میں کسی تانگے میں بیٹھی سادہ سی لڑکی کے جذباتی جملے کا ذکر تھا جس کا نخچیر ناصر کا نازک دل ہوا تھا۔ اب اسے کافی عرصہ گذر چکا ہے اور ناصر تدبر، تفکر، تعقل کے کئی مراحل طے کر چکا ہے اور غمِ جاں سے غمِ جہاں تک پہنچ چکا ہے، تبھی تو اس کے شعری سفر کی منزل پر یہ آواز سنائی دیتی تھی۔

ایکسو بیانولے

عجیب دیدنی منظر تھا شامِ آمدِ یار
گلی میں سینے پہ رکھے تھے ہر مکان نے ہاتھ

اب اسے سفر کرتے کرتے منازل طے کرتے کرتے اتنی دور آ کر ''نگہ بازپسیں'' کے زیرِ اثر خیال آیا کہ

ورق کچھ ڈائری میں رہ گئے ہیں
جوانی کو دوبارہ ڈھونڈتا ہوں

وہ اپنے آپ کو واپس اسی زمانے میں لے جاتا ہے، اور اسے کچھ کھونے کا احساس شدت سے ہوتا ہے، یہ کھویا ہوا ''کچھ'' بہت قیمتی ہے۔

خود ہی شہر کی سمت مڑا تھا گاؤں سے
جانے مڑ مڑ پھر کیوں اس کو تکتا ہوں

گاؤں کے Compact ماحول سے شہر کے ڈھیلے ڈھالے ماحول میں آنے پر پچھلی باتیں جو شاید خارج کی طرف سفر کی وجہ بنی ہوں یاد آتی ہیں، برادرانِ یوسف کی کارستانیاں بھی یاد آتی ہیں۔

میں دشمنوں کے ستم حرف حرف کہہ دوں گا
مگر وہ کیسے کہوں دکھ جو بھائی دیتے ہیں

یہ دنیا کی محبت کے باعث ماؤف صورت معاشرے کے متنوع ظلم ہیں کہ بھائی کی نسبت ''دنیا'' عزیز تر ہے۔

وہ یہ بھی کہتا ہے۔

تمھاری دید کو دل جب بھی مچلا
تو اپنے سامنے میں ڈٹ گیا ہوں

ناصر رہ رہ کے خود سے ہمکلام ہوتا ہے اور اگر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے پاس ہی بیٹھنا چاہتا ہے، خود سے ہمکلامی کی بھی کوئی مفید صورت نہیں بنتی تو پھر خموشی اور اپنے پاس ہی بیٹھے رہنے میں عافیت ہے۔

جو اپنے پاس ہوں بیٹھا تو بیٹھا رہنے دو
بہت دنوں میں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا

ناصر نے شاید ابھی خارج کی طرف سفر کو مفید نہیں سمجھا کہ اس کے ہاں ابھی تک خوش قسمتی کے وہ گل فروش اور بہت بہجت افزا استارے ملتے ہیں جو اسے گھر، مکان، گاؤں، رستے، اپنے لوگ، اپنوں کی آنکھیں وغیرہ قسم کے استعارے استعمال کرنے پر شہہ دیتے ہیں، ذرا یہ کیفیت دیکھئے اور محسوس کیجئے۔

وہ دو آنکھیں گھر سے ساتھ چلی آئیں
پھر تو تپتا رستہ ، ٹھنڈا سایہ تھا

خود ہی شہر کی سمت مڑا تھا گاؤں سے
جانے مڑ مڑ پھر کیوں اُس کو تکتا ہوں

جو تیرے ہوتے کشادہ تھا شش جہت سے بھی
ترے نہ ہونے سے اب تنگ یہ مکان لگا

ایک ذرا مختلف کیفیت، لیکن ماحول وہی ہے۔

ویراں نظر آتی ہیں پہ سوکھی نہیں آنکھیں
تھوڑا سا دلاسا ہو تو برسات بہت ہے

لیکن میں نے بغور دیکھا تو وہ اپنے ظاہری مکان، یا ماحول ہی سے خود کو باندھ کے نہیں رکھتا بلکہ اس کا ''مکان'' بھی بڑے وسیع تناظر میں اور عظیم جذبے اور آدرش کی روشنی میں کچھ اور مقدس عنصر کی صورت میں ملتا ہے۔

میں کہ شرمندہ ہوں اپنے سامنے مجرم ہوں یوں
اس چمن کو لٹتے دیکھا میں نے اور میں چپ رہا

یہ ہے ایک سچے لیکن بے بس محب وطن کا احساس، جوان حالات میں خود کو صحرائے خفت میں محبوس کر دیتا ہے، البتہ اس کا ایک مثبت پہلو یہ نکلتا ہے کہ ایسے محب وطن اہل دانش کی موجودگی کسی دن تو ایسی آگ بھڑکائے گی جو جلائے گی نہیں بلکہ ماحول کو روشن کر دے گی۔

ابھی ناصر جوان ہے بلکہ نوجوان ہے یعنی اب بھی چشم بددور اپنے تین شہزادوں جیسے خوبصورت بیٹوں کا بڑا بھائی لگتا ہے اور جب ان انتہائی مؤدب ومہذب ہمہ تبسم خوبصورت بلکہ وجیہہ شہزادوں کے ساتھ بزم ادب میں آتا ہے تو پوری بزم میں روشنی سی ہو جاتی ہے اللہ ان پنجتن پر پنجتن کا سایہ رکھے، آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ ''سہ تن'' ہیں پنجتن کیسے ہوئے، یہ ناصر خود بتا دیگا۔

ابھی تک میں ناصر کی غزل کے چند اشعار پیش کر سکا ہوں آپ یقین

فرمائیں اس کی نظمیں بھی بڑی بھرپور اور فکر انگیز ندرت آگیں ہوتی ہیں بلکہ اس کے ہائیکو پڑھیں تو یقین آجائیگا کہ جب بیٹری مکمل Charged ہو تو ہائیکو میں بھی ابلاغ کے جادو جگائے جاسکتے ہیں بشرطیکہ اس کے پیچھے ناصر کا ذہن ہو، سنئے۔

پیاسی آنکھوں میں
اک بوند نہیں پانی کی
سپنے سوکھے ہیں۔

....

موسم ساون کا
ٹپ ٹپ یادیں برسی ہیں
دل کے آنگن میں

بس دعا کیجئے کہ اللہ گلستانِ شعر و ادب میں اس کی خوشبو کو پھیلتا اور نکہتیں بکھیرتا رکھے۔ (آمین)

یوسف رجا چشتی

بندۂ تاخیر

عرصۂ محشر میں آیا ہے یہ بندہ سب کے بعد
خوگرِ تاخیر ہے گو عالمِ جیّد ہے یہ
اِک صدا آئی اسے دنیا میں واپس بھیج دو
ہم سمجھتے ہیں اسے ، ناصر علی سیّد ہے یہ

پروفیسر طٰہٰ خان

محبتیں

میں نے کہانا کہ لمحے ہوں، چہرے ہوں یا محبتیں، مجھے انہیں سنبھالنے کا قطعاً سلیقہ نہیں ہے اور میں بہت سی اچھی چیزوں کو گنوا دیتا ہوں۔ میری یہ بد احتیاطی کمپیوٹر نے بھی اُس وقت چُرا لی جب اُس نے محترم شوکت واسطی، افتخار عارف اور مرحوم اعجاز راہی کے مضامین سمیت میری کتاب کا پورا مسودہ اپنی ہارڈ ڈسک سے اُڑا دیا، صرف اتنا نہیں اس سانحے کے فوراً بعد کمپوزر نے بھی اپنی دکان بڑھا لی اور میں خالی ہاتھ رہ گیا۔ میں نے اپنے لختِ لختِ جگر کو تو کسی حد تک دوبارہ اکٹھا کر لیا مگر ان احباب سے شرمساری کا مجرم بنے بغیر میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔

مجھے انگلینڈ میں بیٹھے پروفیسر حسام حُر اور امریکہ میں موجود عتیق احمد صدیقی کی محبتوں کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جن کی وجہ سے مجھے یہ بے ترتیب خواب ترتیب دینے کا حوصلہ ہوا۔ مجھے یہ اعتراف بھی ہے کہ جواد کی محبت اور دلچسپی کی وجہ سے یہ بیل منڈھے چڑھ پائی ہے اور میں اپنے دوست عمران یوسف زئی کی محبت کا بھی مقروض ہوں جس نے صرف کمپوزنگ ہی نہیں کی اس کی تزئین اور آرائش میں مجھ سے کہیں زیادہ دلچسپی لی۔ سرورق کی تلاش اور ڈیزائننگ کے مشکل کام کو افراز علی سیّد نے ممکن بنایا، سو...... بہت سا پیار اینڈ تھینک یو ویری مچ۔

ناصر علی سیّد

hulam Muhammad Qasir Once Said, ith a touch of emotions, "I keep telling im to forget about television and oncentrate on poetry. He could be a emendous poet. But he is just wasting imself in television." Well I didn't quite gree with him. And today when I read Nasir's poetry and Afsanas I earnestly wish that Qasir Sahib was around so that I could have told him that Nasir has definitely come a long way from the yester years of a famous television playwright and compere. He stands head and shoulder above his stature of last decade. In his latest works I find him at war with himself and the society he is trying to comprehend. He just cant come to terms with things the way they are. He sounds disappointed but then, he takes a deep breath, recovers and says:

پانی بھی ہے زوروں پہ مری ناؤ بھی ٹوٹی
پر حوصلہ لے کر مجھے اُس پار گیا ہے

The ferocity of his verse and the vehemense of his thoughts, call it "Stream of Consciousness" undoubtedly promises a lot more to come. You ain't seen nothin yet.

Attiq Siddiqui
New York.

ISBN 969-9203-00-5